
ZEB-UN-NISA
Lahore
زیب النسا
لاہور

خواتینِ پاک و ہند کا محبوب ماہنامہ

زیب النسآء لاہور

جلد ۳۷ اکتوبر ۱۹۶۹ء شمارہ ۱۰

ایڈیٹر

رشیدہ عصمت

سالانہ قیمت

بذریعہ منی آرڈر ______ سات روپے

بذریعہ وی۔ پی ______ سات روپے پچاس پیسے

بھارت کیلئے

آٹھ روپے پچاس پیسے

غیر ممالک سے :-

بذریعہ بحری جہاز ______ ایک پونڈ

بذریعہ ہوائی ڈاک ______ تین پونڈ

مشرقی پاکستان بذریعہ ہوائی ڈاک ______ ۹ روپے

قیمت فی پرچہ مغربی پاکستان سے ______ ۶۰ پیسے

قیمت فی پرچہ مشرقی پاکستان سے بذریعہ ہوائی ڈاک ۷۵ پیسے

ناشر :- شیخ محمد نواب طابع :- ملک محمد عارف

مطبع :- دین محمدی پریس لاہور

مقام اشاعت :- نزد پوسٹ آفس بیرون کشمیری گیٹ سرکلر روڈ لاہور

فہرست مضامین

خطوط کا آئینہ

ماں کی دولت

مَیں اس بات پر حیران ہوں کہ کیا ماں کا درجہ بھی محض عارضی اور کاروباری ہوتا ہے۔ میرے بچّے کی عمر صرف دو سال کی تھی۔ کہ اس کا باپ اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اب مَیں صرف اس بچے کے لئے زندہ تھی۔ مَیں نے مصیبتوں کے سمندر جھیل کر اپنے بیٹے کی پرورش کی، اسے تعلیم دلائی۔ ان مصیبتوں کی تفصیل بیان نہیں کرنا چاہتی وہ ایک بڑی دکھ بھری کہانی ہے۔ بہرحال میری مسرتوں کی انتہا نہ رہی جب میرا بیٹا یونیورسٹی میں اوّل آیا اسی مدت میں اس نے ایک لڑکی سے محبت شروع کر دی۔ مَیں بھلا اس کے جذبات کو کیسے پامال کر سکتی تھی۔ میرے لئے سب کچھ وہی تھا۔ میری زندگی اسی کے دم سے وابستہ تھی۔ میری آنکھوں کی روشنی وہی تھی۔ مَیں نے بیوگی کے بیس برس صرف اسی کو دیکھ دیکھ کر بسر کئے۔ وہ لڑکی سے محبت کرنے لگا مَیں بہت خوش تھی۔ لیکن وہ شادی سے پہلے ہی مجھے نظر انداز کرنے لگا اب اس کی زندگی صرف وہی لڑکی تھی۔ مجھ سے وہ کوئی بات پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا تھا۔ لڑکی کے والدین نے اس کو ولایت بھجوا دیا۔ وہ مجھ سے آخری بار ملنے آیا تو گویا مجھے اس سے کوئی تعلق نہیں تھا وہ شاید واپس کبھی نہ آئے۔ لڑکی کے والدین اپنی بیٹی کو بھی ولایت بھجوا دیں گے۔ اور وہ وہیں قیام کریں گے۔

مَیں سوچ میں ڈوب گئی۔ میری زندگی کا سہارا تو صرف وہی بیٹا تھا صرف ایک بیٹا ـــ مَیں پھر تنہا رہ گئی۔ اب میرے سامنے صرف تاریکی ہی تاریکی تھی۔ کیا اولاد صرف ایک امانت ہے۔ جس کو پال پوس کر دوسری عورت کے حوالے کر دیا جائے؟ مَیں جذبات کی رو میں بہ رہی ہوں۔ شاید بہنیں مجھے خود غرض کہیں گی۔ لیکن مَیں سمجھتی ہوں کہ ماں کا مقام کچھ بھی نہیں۔

راشدہ بیگم۔ لاہور

ملازمت یا گھر کا کام

میرے میاں کبھی کبھی بڑی ہلکی سی شکایت کرتے ہیں۔ کہ اگر مَیں بھی کسی دفتر یا کسی اور ادارے میں ملازمت کر لوں تو بہتر ہوگا۔ مَیں جانتی ہوں کہ مہنگائی کے اس زمانے میں محدود تنخواہ والوں کی حالت بڑی قابلِ رحم ہے۔ بازار میں اشیاء ہر روز مہنگی ہوتی جاتی ہیں اور چیزوں کی قیمتوں پر کسی حد پر کنٹرول ہوتا ہی نہیں۔ لیکن اس کے باوجود مَیں یہ بھی سوچتی ہوں کہ گھر میں مَیں بہت زیادہ کام کرتی ہوں۔ بچوں کے کپڑے خود سیتی ہوں کپڑے دھو کر استری بھی خود کر لیتی ہوں۔ کبھی کبھی اپنے بچوں کے بال بھی خود کاٹ لیتی ہوں۔ دروازوں اور کھڑکیوں کے شیشے لوشن سے خود صاف کرتی ہوں۔ یہاں تک کہ چھ مہینے کے بعد دروازوں اور کھڑکیوں کو الگ بھی کر لیتی ہوں۔ اگر مَیں کام پر جاؤں تو ظاہر ہے کہ یہ سارے کام نہ کر سکوں گی۔ اور اس طرح مَیں نے جو رقم بچائی ہے وہ میری تنخواہ سے کہیں زیادہ ہو گی۔

دل ہی دل میں مجھے اطمینان ہو جاتا ہے کہ مَیں اپنے شوہر کا کافی حد تک ہاتھ بٹا رہی ہوں۔

رابعہ نسرین۔ راولپنڈی

بلبلوں سے مایوس ہونے کے بعد

دو سہیلیاں ایک دوسری کو اپنے روزمرہ کے ایسے حالات سُنا رہی تھیں۔ جو ان کے خیال میں مزیدار اور ہنستے ہنسانے کے قابل تھے۔ ایک نے کہا "جب مَیں اپنے گُڈّے سے روز ایک نیا کھیل کھیلتے کھیلتے تنگ آ گئی

یعنے کھیلنے کو نئی نیا کھیل نہ رہا۔ تو اب صابن ملے پانی کے بلبلے چھوڑ کر اسے ان کے نیچے بھگانے لگی ہوں۔ جب بلبلے غائب ہوتے ہیں تو اس کے چہرے کی کیفیت دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔" دوسری بولی "بہت اچھا کرتی ہو۔ مگر جب میں نے اپنے کتے سے یہی کھیل کھیلا تو دو دن بعد بلبلا غائب ہوتے ہی وہ پلٹ کر مجھے کاٹنے دوڑا۔" اس لئے ذرا ہوشیار رہنا۔"

آسیہ ضمیر۔ راولپنڈی

ڈیڈی کو نصیحت

ڈیڈی اپنی پیاری پیاری بٹیا غزالہ کو جس کی عمر صرف چار برس کی ہے۔ کھانے کی میز پر بیٹھ کر ضیافت کھانے کے آداب سکھا رہے تھے۔ انہوں نے کہا "شوربہ کپڑوں پر گرانا نہیں" غزالہ نے انہیں یقین دلایا "جی نہیں۔ ہرگز نہیں گراؤں گی" اور پھر کہنے لگی" مگر آپ بھی نوالہ چباتے ہیں چپ چپ کی آواز نہ کیجئے گا"

قدسیہ آفتاب۔ لائل پور

ایک اور ننھی

ہمارے ہاں جب ایک خوبصورت سی پیاری پیاری ننھی ہوئی تو اس کی ننھیال اور ددھیال والوں میں سے سب نے یہی کہا کہ اب کے اس کا ایک ہنستا کھیلتا بھائی ہونا چاہیئے تاکہ فیملی مکمل بھی ہو جائے اور ننھا بھائی اس کے ساتھ کھیلا بھی کرے۔ ہم دونوں میاں بیوی بھی ان لوگوں کی اس تمنا میں شریک تھے۔ چنانچہ ہم نے ننھی کے ہونے والے بھائی کے لئے بڑے چاؤ سے چیزیں تیار کیں۔ مگر ہوا کیا؟ ایک اور ننھی

شمیمہ رضویہ۔ کراچی

آپ ہی بھول گئیں

ہماری کوٹھی اور برابر والی کوٹھی کے چمنوں کے درمیان مہندی کی ایک باڑھ ہے۔ جس میں ہم نے آنے جانے کے لئے ایک تنگ سا راستہ بنا رکھا ہے۔ جب ہمسائی کا کتا بڑا ہونے لگا۔ تو وہ اس راستے میں سے گزر کر ہمارے ہاں آکر چیزیں خراب کرنے لگا۔ ہمسائی نے اس راستہ کے نچلے حصے میں ایک پستہ دیوار بنوا دی۔ اور اطلاع کے طور پر مجھ سے کہا کہ اس راستے سے گزرتے میں خیال رکھنا۔ کہیں ٹکرا نہ جاؤ ورنہ اوندھے منہ گرو گی۔ مگر اس اطلاع کے تھوڑی ہی دیر بعد باڑھ کی طرف سے کسی کے گرنے کی آواز سنائی دی۔ اور میں نے وہاں پہنچ کر دیکھا تو ہمسائی اوندھے منہ گری ہوئی بڑے زور زور سے ہنس رہی تھیں۔

رقیہ خانم۔ لاہور

زمانے کا تقاضہ

میں میک اپ کرنے میں مصروف تھی۔ اور بہت تھوڑے وقت میں یہ کام ختم کر کے جلد از جلد اپنی سہیلی کے ہاں پہنچ جانا چاہتی تھی جہاں ہم سب سہیلیوں کی ایک شاندار پارٹی تھی۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر میرے خسر کوچ میں دھنسے ہوئے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ مگر میری چھٹی حس نے مجھے بتایا۔ کہ مجھے میک کرتے دیکھ رہے ہیں بلکہ مشاہدہ کر رہے ہیں میرا یہ اندازہ درست ہی نکلا۔ جب میں میک اپ کر چکی تو بولے "بیٹی جو چہرہ قدرتی طور پر خوبصورت ہو اسے میک اپ سے خوبصورت بنانا غیر ضروری ہے۔ اور جو چہرہ خوبصورت کہلانے کے قابل نہ ہو۔ اس پر میک اپ تھوپنے سے فائدہ؟ میں نے ان کی اس بات کا کوئی جواب نہ دیا اور دوسرے کمرے میں چلی آئی۔ مگر چند منٹ بعد اپنے شوہر کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ وہ کہہ رہے تھے" ابا جی۔ ایک حکمت آموز مقولے کی حیثیت سے آپ کی یہ بات بالکل درست ہے مگر آپ کو وہ مقولہ بھی تو یاد ہو گا۔ کہ "زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز۔" موجودہ زمانے کی عورتیں اس لئے بھی



میک اپ کرتی ہیں۔ کہ وہ زیادہ حسین نظر آئیں گی۔ جس میں وہ زمانے کا ساتھ دیتی ہیں۔ چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی۔ میں اپنے شوہر کی اس سمجھداری پر بہت خوش ہوئی۔

شائستہ اسحاق۔ کوئٹہ

قابلِ غور کھٹور پن

ہمارے پڑوس میں ایک محترمہ رہتی ہیں جنہوں نے اپنے شوہر کو یہ مستقل حکم دے رکھا ہے کہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے وقت جوتے اتارا کرو اسی طرح ان صاحبہ نے اپنے شوہر اور بچوں کو ڈرائینگ کمرے کے اندر قدم رکھنے کی بھی ممانعت کر رکھی ہے۔ یہ کمرہ صرف اس وقت کھولا جاتا ہے جب مہمان آئے ہوئے ہوں ان کی کوٹھی کا گھاس کا میدان بڑا عمدہ ہے مگر گھر کے کسی فرد کو اس پر چلنے پھرنے اور دوڑنے تو کجا پاؤں تک رکھنے کی اجازت نہیں۔ اور اگر برآمدے کے چپس کے فرش پر کسی کے قدموں کے نشان نظر آجائیں تو ان صاحبہ پر غصے کا دورہ پڑنے لگتا ہے ہمارے ملک میں ایک محکمہ ہے جس کا نام ہے انسداد بے رحمی مویشیاں کیا معاشرے کو ایک محکمہ ایسا بھی نہیں کھولنا چاہیئے جس کا نام ہو "انسداد بے رحمی شوہراں"

(ایک شوہر)

الارم کلاک

مَیں نے اپنی ایک سہیلی کی زبانی سُنا کہ انہوں نے گھر میں تین الارم کلاک رکھے ہوئے ہیں تاکہ وہ صبح بیدار ہو سکیں۔ لیکن اس کے باوجود انہیں صبح خیزی میں ہمیشہ دیر ہو جاتی ہے۔ کلاک کے الارم بجتے ہیں تو وہ انہیں بند کر کے پھر سو جاتے ہیں۔ اور ان کے میاں اکثر دفتر دیر سے پہنچتے ہیں۔

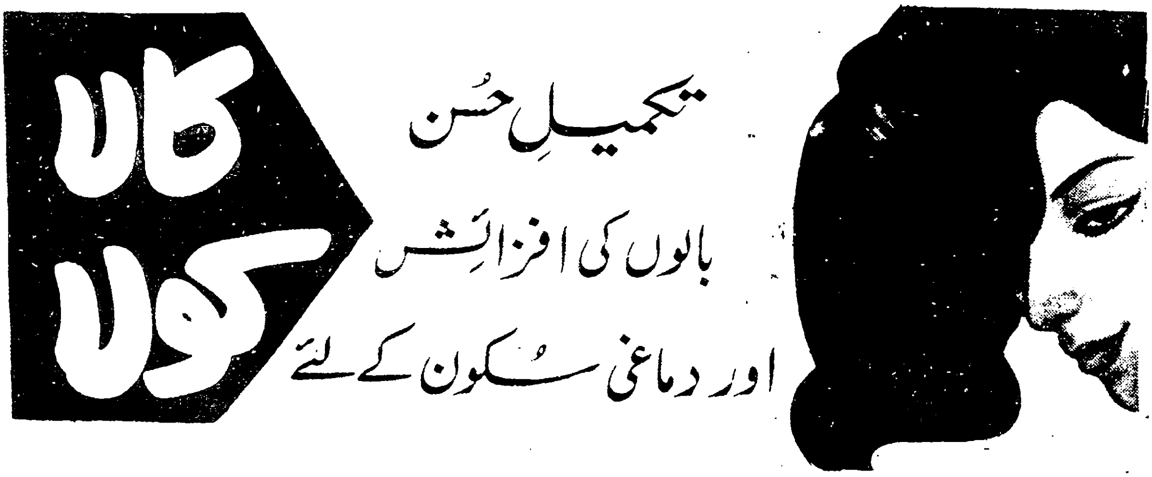
مَیں حیران ہوں کہ آخر کلاک کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اوّل تو انسان ارادہ کر کے سوئے کہ وہ صبح جلدی اُٹھے گا تو خواہ مخواہ آنکھ کھل جاتی ہے اور میرے پاس تو دو "الارم کلاک" ہیں۔ یہ میرے دو بچے۔ ایک کی عمر تین برس کی ہے اور دوسرے کی ساڑھے چار برس کی۔ یہ دونوں "الارم کلاک" صبح ہی بیدار ہو جاتے ہیں اور پھر مجھے اور میاں کو سونے کی فرصت ہی نہیں مل سکتی۔ جی چاہتا ہے اتوار یا چھٹی کے دن ذرا دیر تک سوتے رہیں لیکن ان دونوں بچوں کے لئے سب دن ایک جیسے ہیں اور ان کی وجہ سے ہم کبھی دیر سے نہیں اُٹھے۔

صبیحہ عظیم۔ لاہور

چاند کی تسخیر پر نسوانی تبصرے

انسان کے چاند پر اُترنے کے سلسلے میں آجکل نسوانی حلقوں میں طرح طرح کی باتیں کی جا رہی ہیں جن میں سے بعض سننے کے قابل ہیں۔ ایک دن میرے ہاں میری کچھ سہیلیاں جمع تھیں۔ باتوں باتوں میں چاند کی تسخیر کی مہم کا ذکر چھڑ گیا۔ ایک صاحبہ کہنے لگیں "بعض لوگ خواہ مخواہ یہ کہہ کر جلے دل کے پھپھولے پھوڑ رہے ہیں کہ انسان پہلے اس دنیا کے جھگڑے تو نپٹائے پھر چاند کی تسخیر جیسی مہمات شروع کرے۔ بھلا انسان کہیں مہم جوئی ترک کر سکتا ہے۔ اسی کے ولولے سے تو زندگی میں تنوع اور خوش آئند جوش و خروش پیدا ہوتا ہے" مگر ان کے بات ختم کرتے ہی ایک اور صاحبہ نے کہا۔ "نوج! ایسی بھی کیا مہم جوئی کہ چاند کی مٹی کھود کھود کر لانے لگے۔ کیا آپ کسی بچے کی اس قسم کی مہم کی حوصلہ افزائی کریں گی کہ وہ اپنے باپ یا چچا کا منہ نوچنے کی کوشش کرنے لگے؟"

(ایک خاتون)



نصیرؔ کوٹی

ہمیں فراق نہ تسکین کا سبب ہوگا
اگر ہوا بھی تو یہ حادثہ عجب ہوگا

ہم اُن کے طرزِ تغافل پہ خود سے کہتے ہیں
ضرور یہ بھی محبّت کا کوئی ڈھب ہوگا

ہے التجا پہ کرم آپ کا شعار مگر
ہمارے حال پہ لیکن کرم ہی کب ہوگا

کسی کی سمت تحیّر سے دیکھنے والو
عتاب تم پہ ہُوا اگر تو بے سبب ہوگا

نہ جانے کتنے فرشتوں کے راز ہونگے عیاں
ہمارا دفترِ عصیاں اگر طلب ہوگا

نصیرؔ خاکِ نشیمن پہ تا بہ کے گریہ
یہ حادثہ تو گلستاں میں روز و شب ہوگا

عبداللہ ساغرؔ

برق جب آسمان پہ لہرائی
مجھ کو یاد آئی تیری انگڑائی

تُو نے ہر بات میری ٹھکرائی
مَیں نے ہر بات تیری اپنائی

زخم سینے کے کھل اُٹھے اے دوست
جیسے گلشن میں پھر بہار آئی

ایک مدّت سے قلب مضطر میں
بج رہی ہے غموں کی شہنائی

مَیں دعاگو ہوں اب بھی اس کیلئے
چھین لی ہے جس نے میری سب شکیبائی

جب کبھی میرا دل دکھایا گیا
مجھ کو اک بے وفا کی یاد آئی

تیرا ساغرؔ تو اب بھی محزوں ہے
سُن رہے ہیں کہ پھر بہار آئی

یاسمین مظہر

ہم سے نظریں کبھی بھولے سے ملاؤ تو سہی
خلشِ عشق مرے دل میں بڑھاؤ تو سہی
مجھ کو ہوگا نہ کبھی دل کی تباہی کا ملال!
تم کبھی برقِ نظر اپنی گراؤ تو سہی
مسکراؤ کہ بہاروں کا تمنائی ہوں
اجڑی بستی کو مرے دل کی سجاؤ تو سہی
شکوۂ تلخیٔ ایّام کو دل سے دھو دے
مجھ کو ایسا بھی کوئی نغمہ سناؤ تو سہی
تم کو دعوےٰ ہے کہ تم مرے شریکِ غم ہو
میری بربادی پہ کچھ اشک بہاؤ تو سہی
عین ممکن پسِ پردہ ہوں کچھ آثارِ الم
پردۂ رخ کو ذرا اپنے ہٹاؤ تو سہی
ان کے دل پر بھی اثر ہو سکے شاید مظہر
داستاں اپنی محبت کی سُناؤ تو سہی

سالنامہ ۱۹۷۰ء

حسبِ معمول جنوری ۱۹۷۰ء کا شمارہ سالنامہ ہوگا۔ اس نمبر کی تیاری ابھی سے شروع کر دی گئی ہے۔ اس نمبر کی خصوصیات، عظیم ادبیات ناول، دلآویز اور محیر العقول باتصویر فیچر جو آپ نے پہلے نہ پڑھے ہونگے خواتین کے خاص طور پر کارآمد مضامین، حسن و صحت، بچوں کی تربیت ازدواجی کہانیاں، معیاری افسانے شریکِ اشاعت ہوں گے۔ دفتر ہر معیاری اور دلچسپ افسانہ کا معاوضہ پیش کرتا ہے۔ آپ اگر اچھے افسانے لکھ سکتی ہیں تو ضرور اس میں حصہ لیں۔ اُلجھے ہوئے پلاٹ کا افسانہ قابلِ قبول نہ ہوگا۔ افسانہ یکم نومبر ۱۹۶۹ء تک دفتر میں پہنچ جانا چاہیئے۔

(ادارہ)

- جن محترم زیبی بہنوں کو مسلسل پرچہ نہ ملنے کی شکایت ہے وہ اپنے یہاں انکوائری کرائیں اور دیکھیں کہ کون شرارت کرتا ہے اس کے ساتھ ہی آپ پوسٹ ماسٹر جنرل ناردرن سرکل لاہور کو شکایت کریں۔
- دفتر سے ہر خریدار کو مقررہ تاریخ پر ماہنامہ بھیجا جاتا ہے۔ خریداروں کے پتوں کی چٹیں بڑی احتیاط اور پوری ذمہ داری سے چیک کی جاتی ہیں۔ یہ مت سوچیں کہ دفتر پرچہ روانہ کرنا بھول جاتا ہے۔ بھول کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔
- جن بہنوں کو یہ خدشہ ہے کہ ان کا سالنامہ گم ہو جاتا ہے یا انہیں ہر سال نہیں ملتا۔ دفتر انہیں مشورہ دیتا ہے کہ وہ اسے بذریعہ رجسٹری طلب کریں۔ رجسٹری محصولڈاک کیلئے صرف پچاس پیسے کے ٹکٹ ارسال کریں اور ساتھ ہی اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔ جن محترم بہنوں کو جنوری سالنامہ وی۔پی سے آتا ہے وہ ٹکٹ ارسال نہ کریں۔ دفتر اس مرتبہ سالنامہ کی شکایت کی تعمیل نہیں کرے گا۔ بہتر ہے کہ ٹکٹ بھیج کر رجسٹری کی صورت میں سالنامہ منگائیں اس طرح گم ہونے کا خدشہ نہیں رہتا۔ یہ آٹھ آنہ (۵۰/۰) رجسٹری محصولڈاک کا ہے۔ دفتر سالنامہ پر جو رجسٹری کے علاوہ محصولڈاک لگے گا وہ اپنے پاس سے لگائے گا۔

(مینیجر)

بیگم طلعت

آئیڈیل عورت

یہ سوال ہمیشہ انسانی ذہن میں اُلجھن پیدا کرنے کا باعث بنا رہا ہے۔ کہ مرد ایک عورت میں کن چیزوں کو تلاش کرتا ہے۔ اور وہ کونسی خصوصیات ہیں جو عورت کو مرد کی محبت کا مرکز بناتی ہیں۔ یہ سوال اس قدر اہم ہے کہ اس کے متعلق جتنی بھی بحث کی جائے برادھورا رہ جاتا ہے

دوسری طرف عورتیں بھی یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتی ہیں کہ وہ کونسے عوامل ہیں جو مردوں کی توجہ اپنی طرف جذب کرنے میں موثر ثابت ہوتے ہیں۔ بعض عورتیں اس مسئلہ کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دیتیں اور اسے غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیتی ہیں۔ یہ عورتیں مردوں کا دل موہنے میں کامیاب نہیں ہوتیں۔ اس کے برعکس بعض عورتیں ایسی بھی ہیں جو اپنی خاص صفات کی بدولت مردوں کی آئیڈیل تصور کی جاتی ہیں

سوال یہ ہے کہ عورتوں کی جذب اور کشش کا راز کیا ہے؟ اور وہ کیا خوبیاں ہیں جن کی بدولت وہ مردوں کی توجہ کا مرکز بن جاتی ہیں۔ اگر ان عورتوں سے جو کسی ادارے میں کام کرتی ہیں۔ اس کے متعلق سوال کریں تو وہ جواب دیں گی کہ مردوں کی طرح عورت کو بھی کام کرنا اور اپنی شخصیت کو ابھارنا چاہیئے۔ عورت اسی خوبی سے متصف ہو کر مردوں کی آئیڈیل بن سکتی ہے۔ لیکن یہی سوال کسی گھریلو عورت سے کیا جائے تو کیا وہ بھی اسی قسم کا جواب دے گی؟ نہیں اس کا نظریہ یہ ہے کہ زیادہ تعلیم یافتہ عورتیں مردوں کو پسند نہیں آتیں۔ بلکہ وہ ایسی عورتوں کو پسند کرتے ہیں جو امورِ خانہ داری، بچوں کی تربیت اور گھریلو مسائل سے بخوبی واقف ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں قسم کی عورتیں اپنے اپنے دلائل رکھتی ہیں۔ لیکن یہ دلائل ٹھوس ہونے کے باوجود ایک آئیڈیل عورت کے تصور کو مکمل نہیں کرتے۔

مردوں کا ایک طبقہ ایسا ہے جس کی نظر میں ایک آئیڈیل اور مثالی عورت وہ ہو جو شرم و حیا کا پُتلا ہو۔ اس کی شرگیں نگاہیں اپنے بزرگوں کے سامنے جھکی رہیں۔ سر پر دوپٹہ کا آنچل ڈھلکا ہے۔ لباس ایسا ہو کہ جس کے تمام حصے چھپے رہیں، گفتگو میں شائستگی اور ادب کوٹ کوٹ کر بھرا ہو۔

ابھی حال ہی میں نیویارک میں ایک ادارہ نے شاید تاریخ میں پہلی مرتبہ اس نازک مسئلہ کے متعلق چھان بین کی ہے۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ اس مسئلہ کے متعلق مختلف نظریات کا جائزہ لینے کے بعد ایک آئیڈیل عورت کی خصوصیات کے متعلق ایک قابلِ اعتماد نتیجہ برآمد کیا جائے چونکہ یہ ادارہ بین الاقوامی حیثیت کا حامل ہے۔ اس نے اس سوال پر اپنی تحقیق کے دائرہ کو دنیا کے تمام حصوں تک پھیلا دیا۔ اور بہت سے ملکوں کی عورتوں سے اس کے متعلق ان کے نظریات معلوم کئے۔

اس ادارہ کے ماہرین نے اس سلسلے میں پچاس سے زیادہ ملکوں کو ایک سوال نامہ بھیجا جس کے جوابات کی روشنی میں اس نے اپنے نتائج اخذ کئے۔ اس سوالنامہ کے ایک حصہ میں عورتوں سے یہ سوال کیا گیا تھا کہ کیا دنیا کی سب سے بڑی خوشی عورت کو گھر کی چاردیواری میں میسر آتی ہے یا وہ گھر سے باہر رہ کر اس خوشی سے ہمکنار ہو سکتی ہے۔ اس کے متعلق مختلف ملکوں کی عورتوں نے اپنے منطقی نظریات کا اظہار کیا۔ سوالنامہ کا دوسرا حصہ بھی متعدد سوالات پر مشتمل تھا جن کے جواب میں عورتوں نے اپنے الگ الگ نقطہ ہائے نظر پیش کئے۔ اس شعبہ میں جواب دینے والی ۹۵ فیصد عورتوں نے جو جوابات دیئے ان میں انہوں نے رنگ و نسل اور مذہب سے بالاتر ہو کر ایک ایسے شوہر کو پسند کیا۔ جو قابلِ اعتماد ہو، جس کے ساتھ وہ زندگی کی خوشی اور مسرتوں

سے بھرپور ایک ایسا گھر بنائیں جہاں وہ بچوں کے جھرمٹ میں زندگی بسر کریں اور انہیں پروان چڑھائیں۔

گھر سے باہر عورت کے کام کرنے کے متعلق اکثر عورتوں نے یہ نظریہ ظاہر کیا کہ اگر ایک عورت اپنی زندگی کے لیل و نہار اس طرح ترتیب دے کہ وہ گھر کے فرائض کے ساتھ بیرونی فرائض بھی ادا کر سکے تو وہ آئیڈیل بن سکتی ہے۔ اس نظریہ کی حامی عورتوں کا عقیدہ یہ تھا کہ عورت بیک وقت گھر کے اور اپنی ملازمت کی جگہ کے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دے سکتی ہے

ان جوابات کے تجزیہ سے جو اس سوالنامہ کے جواب میں موصول ہوئے یہ حقیقت آشکارا ہوئی کہ اگر عورت کو گھر یا اپنی ملازمت میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنے کا موقع دیا جائے۔ تو وہ گھر کو ترجیح دے گی اور گھر کے باہر کام کرنے سے گریز کرے گی۔

اس جائزہ کے بعد ماہرین نے یہ محسوس کیا کہ اس سلسلے میں مردوں کے نظریات بھی معلوم کرنے ضروری ہیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ وہ اپنے نقطہ نظر سے کس عورت کو مثالی سمجھتے ہیں۔ چنانچہ پچاس سے زیادہ ملکوں کے مردوں سے اس کے متعلق متعدد سوالات کیئے گئے۔ جن کے تجزیہ کے بعد سماجی ماہرین بالآخر اس نتیجہ پر پہنچے۔ کہ مردوں کی اکثریت نے اس سوالنامہ کے اکثر جواب نفی میں دیئے۔ یعنی جہاں عورتوں کا یہ عقیدہ تھا کہ فلاں کام مردوں کی پسندیدگی کا باعث ہے۔ وہاں مردوں نے اس کے خلاف اپنے نظریات ظاہر کئے تھے۔

اس طرح ایک آئیڈیل عورت کے متعلق کوئی آخری فیصلہ کرنے میں الجھن اور زیادہ پیدا ہو گی۔

اس مرحلہ پر امریکہ کے بعض چیدہ سماجی ماہرین کو دعوت دی گئی کہ وہ ان نتائج کی روشنی میں اس مسئلہ پر اپنی رائے کا اظہار کریں انہوں نے ان سوالناموں کے جوابات کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد اپنی رائے سے تحقیقات کرنے والے ادارہ کو آگاہ کیا۔

اس جائزہ کے بعد تحقیقاتی ادارہ نے اعلان کیا کہ اس تمام کوشش کے نتیجے میں اس مسئلے کا ایک نہایت سادہ اور مثبت حل ملا ہے اور وہ یہ کہ تمام مردوں کی آئیڈیل عورت وہ ہے جو ہر کام کرتے وقت یہ جانتی ہے کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ اور جو کام وہ انجام دیتی ہے اس کا آخری مقصد اپنے شوہر کی خوشنودی ہوتا ہے۔ اس نکتہ کی مزید وضاحت کرتے ہوئے ادارہ نے بتایا کہ ایک آئیڈیل عورت خود پسندی کی حدود سے نکل کر اپنے ہر کام میں خواہ وہ گھر کی چار دیواری میں کیا جائے یا گھر سے باہر۔ شوہر کی خوشنودی کو اپنا نصب العین سمجھتی ہے۔ یہ قدرتی بات ہے کہ جب وہ اس جذبہ سے سرشار ہو گی۔ تو وہ نہ صرف اپنے شوہر کے معاملہ میں اس اصول پر عمل کرے گی۔ بلکہ اپنے گرد و پیش میں بھی اسے اپنا لائحہ عمل بنائے گی۔ اور یہی وہ امتیازی خصوصیت ہے جس سے ایک عورت آئیڈیل بن سکتی ہے۔

شادی کے دلچسپ واقعات

بقیہ صفحہ ۱۲

تبت میں ایک نرالا طریقہ ہے وہاں کئی بھائی مل کر ایک ہی بیوی سے گزارا کرتے ہیں۔ وہاں بھائی بھائی عام طور پر اکٹھے ہی رہتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ گھر کے کام کاج کے لئے اگر ایک ہی عورت ہو تو اس میں زیادہ سہولت ہوتی ہے۔ چنانچہ ان کی ایک ہی بیوی ہوتی ہے۔

ہمالیہ کے کئی علاقوں میں بھی کثرتِ ازواج صرف ان لفظوں میں ہے کہ ایک عورت تین یا چار خاوند کرتی ہے۔ اور سب کو اس بات کا علم ہوتا ہے۔ یہ خاوند آپس میں مفاہمت کر کے اپنی سہولت کے مطابق اوقات مقرر کر لیتے ہیں۔

جزیرہ ہوائی اور برما کے بعض علاقوں میں یہ اجازت ہے کہ حالات کے مطابق ایک شخص اپنی بیٹی یا بہن سے بھی شادی کر سکتا ہے

برطانیہ کے قانون کے مطابق لڑکی سولہ برس کی عمر سے اوپر ہو تو شادی کر سکتی ہے۔ اور اگر اس کی عمر سولہ برس سے کم ہے تو اس کے لیے والدین کی اجازت حاصل کرنا بہت ضروری ہے شادی کیلئے ضروری ہے کہ گرجا میں ہو یا رجسٹرار شادی کے دفتر میں۔ شادی صرف صبح چھ بجے سے شام کے آٹھ بجے تک ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہو وہ قانون شکنی کے مترادف خیال کیا جائے گا۔

خط و کتابت کرتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

قدسیہ بانو۔ ایم۔ اے

شادی کے دلچسپ واقعات

لندن میں ایک شادی ہوئی، برتھا نے ریمنڈ سے شادی کی ریمنڈ کے باپ نے گرجا میں برتھا کی بڑی بہن کو دیکھ لیا۔ وہیں بات پکی ہوئی۔ اور دوسرے دن گرجا میں بہت دوست اکٹھے ہوئے۔ آج برتھا کی بڑی بہن کی ریمنڈ کے باپ سے شادی ہونے والی تھی۔ یہ عجیب رشتہ تھا۔ ریمنڈ کا باپ برتھا کا بہنوئی تھا اور ریمنڈ اس کا سوتیلا بیٹا بھی۔

لندن میں ایک اور دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ ایک ہسپتال میں دو بچے پیدا ہوئے۔ ایک لڑکی اور ایک لڑکا۔ دونو بھائی بہن تھے دونوں کی پرورش ایک "کارنٹی کونسل" کے ہوسٹل میں ہوئی۔ دونوں بڑے ہوئے تو الگ الگ ہو گئے۔ لڑکی کو ایک شخص نے متبنٰے بنا لیا۔ تقدیر کا چکر دیکھئے کہ کئی برس بعد دونوں بہن بھائی کی ملاقات ہوتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ اور شادی ہو جاتی ہے۔ ایک دن خاوند نے پوچھا "تمہارا اصلی نام کیا ہے"۔

"میرا نام مارگریٹ ہیوجز ہے"۔ میاں بھی ہیوجز خاندان سے تھا جب ہسپتال، کارنٹی کونسل کے کاغذات کی پڑتال کی گئی تو وہ اس کی سگی بہن نکلی۔ اسی روز اس نے اسے طلاق دیدی۔

امریکی لوگ شادی اور طلاق کو اہمیت نہیں دیتے۔ امریکہ کی بعض ریاستوں میں بارہ برس کی لڑکی اور چودہ برس کا لڑکا آپس میں شادی کر سکتے ہیں اکثر امریکی ریاستوں میں شادی کے لئے ۱۸ اور ۱۶ برس کی قید ضروری ہے وہاں یہ عجیب بات ہے کہ ٹیلیفون پر بھی شادی ہو جاتی ہے یہ سلسلہ جنگ عظیم سے شروع ہوا تھا۔ ٹیلیفون کے نزدیک پادری اور دولہن دونوں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دوسری طرف دوسرے ملک میں ٹیلیفون پہ دولہا بات کر رہا ہوتا ہے۔ بعدازاں کاغذات رجسٹری کے لئے بھجوا دیئے جاتے ہیں۔

فرانسیسی اس معاملے میں بہت سخت ہوتے ہیں وہ کبھی ٹیلیفون پر شادی نہیں کرتے۔ اگر لڑکی کی عمر ۲۱ برس سے کم ہے اور اس کا فرانسیسی باپ شادی کی اجازت نہ دے تو ملک کا کوئی قانون اس شادی کو تسلیم نہیں کرے گا۔ عدالت کا یہ فیصلہ ہے کہ وہ باپ کے فیصلے میں مداخلت کرنے کی کسی صورت میں بھی مجاز نہیں۔

شادی سے پہلے فرانسیسی بیوی سے زیادہ اختلاط جائز نہیں کیونکہ فرانسیسی قانون کے مطابق مرد اور عورت دونوں کو زنا کے جرم میں طویل سزائے قید دی جاتی ہے۔ البتہ فرانسیسی خاوند ایک داشتہ ضرور رکھ سکتا ہے لیکن وہ اسے اپنے گھر میں کبھی نہیں رکھ سکتا۔ تعزیرات فرانس کے نزدیک یہ جرم ہے۔

مشرق وسطیٰ اور ایشیا کے اکثر ملکوں میں خاوند اپنی بیوی کو صرف شادی کے دن ہی دیکھتا ہے۔ یہ بات ان کے اخلاق کے منافی ہے کہ شادی سے پہلے وہ اپنی ہونے والی بیوی کی صورت دیکھے۔ اسے شادی کرنے والے والدین یا کوئی اور مرد عورت پر یقین کرنا پڑتا ہے اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ شادی کے دن خاوند کو بیوی کے جسمانی نقائص کا علم ہوتا ہے۔ مشرق وسطیٰ میں اگر اس قسم کا دھوکا ہو تو وہ مرد اسی روز دوسری شادی بھی کر سکتا ہے۔

پالی نیشیا میں اکثر سردار ہر سال ایک نئی شادی کرتے ہیں جب ایک بیوی کا جہیز ختم ہو جاتا ہے تو پھر دوسری شادی رچاتے ہیں ——

(باقی بر صفحہ ۱۱)

جرم و سزا

فرحت افزا

بے گناہ عورتوں کے قاتل

آپ نے ایسی بے شمار داستانیں پڑھی یا سُنی ہوں گی جن کا موضوع یہ ہو گا کہ کس طرح کوئی مرد کسی عورت کی پرستش کرتا تھا یا اسے کسی عورت سے اتنی گہری محبت تھی کہ اس کے لئے اپنی جان تک قربان کر دی لیکن بعض ایسے سفاک مرد بھی ہیں جن کے ہولناک جرائم کے سچے واقعات معلوم ہوئے ہیں۔ جن میں سے کئی نے ایک ایک نہیں کئی کئی عورتوں کو بیدردی سے قتل کر ڈالا۔ ان سنگدل انسانوں نے ان عورتوں کے خون سے اپنے ہاتھ اس لئے نہیں رنگے کہ اس میں کوئی مالی فائدہ تھا یا ان عورتوں سے کوئی ایسا جرم یا قصور سرزد ہوا تھا۔ جس نے ان کے جذبۂ انتقام کو برانگیختہ کر دیا تھا۔ انہوں نے صرف شغل کے طور پر انہیں ہلاک کیا۔ اور جب ان کی اس سفاکی کا پردہ کھلا تو نہ صرف انہوں نے اقرارِ جرم کیا۔ بلکہ اس پر فخر کا اظہار بھی کیا۔

۱۹۴۷ء میں انگلستان کے ایک علاقے ساؤتھ پورٹ میں ایک ڈاکٹر رہا کرتا تھا جس کا نام رابرٹ جارج کلیمنٹ تھا وہ اس جگہ کے سارے ہوٹلوں میں نہ صرف ایک جانی پہچانی شخصیت تھا۔ بلکہ خاصا مشہور و مقبول بھی تھا خاص کر عورتیں اس سے بڑی عقیدت رکھتی تھیں۔ اسی لئے لوگ اسے عورتوں کا دیوتا کہنے لگے تھے اس شخص نے یکے بعد دیگرے چار شادیاں کیں۔ اس کی ایک بیوی مر جاتی تھی تو اسے فوراً دوسری بیوی مل جاتی تھی۔ کیونکہ عورتیں اس سے بیحد خوش تھیں۔ جب اس کی چوتھی بیوی مری تو ساؤتھ پورٹ کی پولیس کو ایک گمنام خط ملا جس میں یہ اطلاع درج تھی کہ ڈاکٹر کلیمنٹ نے اپنی چوتھی بیوی امی وکٹوریہ کو خود ہلاک کیا ہے۔ پولیس کے حلقوں میں اس عجیب اطلاع سے سنسنی پھیل گئی۔ اور پھر نہ جانے کس طرح یہ اطلاع عوام کے کانوں تک بھی پہنچ گئی۔ سارے علاقے میں احتجاج کا ایک تہلکہ انگیز طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ اور لوگوں نے ڈاکٹر کی چوتھی بیوی کی لاش کے طبی معائنے کا مطالبہ شروع کر دیا۔ پولیس نے معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ امی کی لاش دفنانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں کہ اس نے موقعے پر پہنچ کر تدفین رکوا دی۔ اور ڈاکٹر کو حراست میں لے لیا۔ اس کے بعد لاش کا پوسٹ مارٹم کیا گیا۔ مگر اس قسم کا کوئی ثبوت ہاتھ نہ لگا جس سے متوفی عورت کے شوہر کو اس کا قاتل ٹھہرایا جا سکتا۔ آخر یہ معاملہ سائنسدانوں کے حوالے کیا گیا۔ اور انہوں نے بڑی گہری تحقیق کے بعد یہ دعویٰ کیا کہ متوفی عورت کی ریڑھ کی ہڈی کے ایک حصے میں سے جس کا وزن صرف ایک اونس ہے گھنڈی دار پن کی گھنڈی کے برابر مورفائن برآمد ہوئی ہے۔ زہر کی یہ قلیل ترین مگر قاتل مقدار ڈاکٹر کلیمنٹ نے اپنی بیوی کی ریڑھ کی ہڈی میں اس وقت اتاری تھی جب وہ غشی کے دورے کی وجہ سے بیہوش تھی۔

مگر اس نے سائنسدانوں کے انکشاف کا انتظار نہیں کیا۔ رپورٹ سامنے آنے سے پہلے ہی اس نے مورفائن کھا کر خودکشی کر لی۔

ایک اور مارشل پٹیو نے ۶۳ عورتوں کو ہلاک کیا۔ یہ سانحے اس دور کے پیرس سے تعلق رکھتے ہیں۔ جب پچھلی عالمی جنگ کے دوران میں جرمنوں نے فرانس کو فتح کر کے اس پر اپنا قبضہ جما لیا تھا۔ پٹیو کو بچپن سے عورت کے نام سے نفرت تھی۔ جب وہ جوان ہوا تو معصوم لڑکیوں کو ورغلا کر ان کا اغوا کرنے کے بعد انہیں ہلاک کرنے لگا مگر اس طرح

کہ اس پر کسی قتل کا جرم کبھی ثابت نہ ہوا۔ پھر جب فرانس پر جرمنوں کا قبضہ ہوا تو اس نے پیرس پہنچ کر وہاں اپنا اڈہ جمایا اور خود کو قوم پرست فرانسیسیوں کی تحریک مدافعت کا ایک کارکن مشہور کیا۔ بقول اس کے اس کا کام یہ تھا کہ جو فرانسیسی جرمنوں کے زیر قبضہ علاقے سے بھاگنا چاہیں انہیں محفوظ فرار میں مدد دے۔ وہ عورتوں پر اپنی توجہ خاص طور سے مرکوز کرتا تھا۔ اور انہیں ملیریا کش دوا کے پردے میں زہر دے کر مار ڈالتا تھا۔ اس زہر میں یہ خاصیت تھی کہ اس کا شکار تڑپ تڑپ کر جان دیتا تھا۔ جب پیرس کے شریف خاندانوں کی عورتیں یہ زہر کھا جانے کے بعد مرغ بسمل کی طرح تڑپتی ہوتی تھیں تو یہ سنگدل کمرے کی دیوار کے ایک سوراخ میں سے جھانک کر ان کے تڑپنے کا تماشا دیکھتا تھا اور خوب خوش ہوتا تھا۔ اس نے یہ سوراخ اس دیوار میں خاص اسی مقصد سے بنوایا ہوا تھا۔

جب یہ عورتیں ختم ہو جاتی تھیں تو مارشل انہیں چونے کے گڑھے میں دفن کروا دیتا تھا۔ جس کے بارے میں یہ ظاہر کرتا تھا کہ اس میں دیواروں پر پھیرنے والی سفیدی ہے۔ اس موذی انسان کا بھی آخر کار بھید کھل گیا۔ اور اسے ۱۹۴۶ء میں گلوٹین سے مار ڈالا گیا۔ اس پر قتل کی ستائیس وارداتوں کا جرم عائد کیا گیا مگر یہ خونی اصرار کرتا رہا۔ کہ اس نے تریسٹھ قتل کئے ہیں۔

اس سے بھی زیادہ خوفناک خونی ایک شخص ولیم پامر تھا جو انگلستان کے علاقے سٹیفورڈ شائر کا رہنے والا تھا۔ اس نے اپنی ایک بے حد عزیز دوست کو صرف شغل کے طور پر زہر دیا پھر اپنی چار بچیوں کو زہر دے کر مارا۔ اور جب اس کی بیوی بیمار پڑی۔ تو اسے کالرا بتا کر زہر کا ٹیکہ لگا دیا۔ جس سے وہ آناً فاناً ہلاک ہو گئی۔

اس آخری قتل کی تہ میں شغل کے علاوہ مالی فائدے کی بھی امید تھی پامر کی بیوی این تھورنٹن بیس ہزار پونڈ کی وارث تھی اور پامر نے اس کا تیرہ ہزار پونڈ کا بیمہ بھی کروا رکھا تھا۔ بیمہ کمپنی کو شبہ تھا۔ کہ اس شخص نے بیمے کی رقم وصول کرنے کے لئے اپنی بیوی کو ٹھکانے لگایا ہے مگر وہ اس پر قتل کا جرم ثابت نہ کر سکی۔

اس سے پامر کو اور شہ ملی۔ اس مرتبہ اس نے اپنی ایک آشنا عورت کو جس کا ہزاروں پونڈ کا بیمہ تھا۔ وہسکی میں پروسک ایسڈ ملا کر پلا دی مگر اس مرتبہ بیمہ کمپنی نے بیمے کی رقم ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ گو پامر پر قتل کا جرم اب بھی ثابت نہ ہوا۔ اس کے بعد پامر نے ایک ایسی عورت کو اپنے جرم کا نشانہ بنانے کی ٹھانی۔ جو ایک ریس کورس کی مالکہ تھی۔ اور اس نے اس عورت کو برانڈی پلاتے وقت اس میں زہر ملا دیا۔ مگر مقتولہ کی خادمہ نے اسے زہر ملاتے دیکھ لیا تھا۔ اس عورت کے بیان پر پامر کو پھانسی دے دی گئی۔

اس قسم کے موذی مرد جو عورتوں کو بطور شغل ہلاک کرتے ہیں۔ موجودہ صدی ہی میں پیدا نہیں ہوئے ہیں بلکہ اس سے پہلے بھی ہوتے رہے ہیں ۱۸۸۰ء میں کارک کاونٹی کے ایک مقام شانڈی ہال میں ایک فوجی سرجن فلپ کراس رہا کرتا تھا اس نے اپنی بیوی کو اس لئے زہر دے کر ہلاک کیا تھا کہ وہ کسی عورت کو تڑپ تڑپ کر جان دیتے ہوئے دیکھنے کا شوق رکھتا تھا۔ مگر اس سے اپنا جرم چھپایا نہ جا سکا۔ چنانچہ خود ہی پولیس پر ظاہر کر دیا۔ جس کے بعد اسے پھانسی دے دی گئی۔

مگر زہر دے کر ہلاک کرنے کا وہ واقعہ اس سے بھی زیادہ ہولناک تھا جس کا ارتکاب ایک امریکی نژاد ڈاکٹر ہولے ہاروے کریپن نے کیا۔ اس کی بیوی رقاصہ تھی۔ ہاروے کو اس کا رقص، گاہکوں میں جسم تھرکانا اور مٹکانا بہت برا لگتا تھا چنانچہ نفرت کی پیاس یوں بجھائی کہ اسے ہایوسائن کھلا کر ہلاک کر دیا۔ اور پھر لاش کے ٹکڑے کر کے سر اور ہاتھ پاؤں رود بار انگلستان میں پھینک دیئے۔ جبکہ باقی جسم اپنے گھر میں کوئلوں کی کوٹھڑی میں تختہ فرش کے تلے دبا دیا۔ اس جرم کی اطلاع کسی نہ کسی طرح پولیس کو ہو گئی۔ جب قاتل ڈاکٹر کو یہ معلوم ہوا کہ پولیس اس کی تلاش میں ہے تو وہ لندن سے فرار ہو کر کیوبک جا پہنچا مگر وہاں گرفتار کر لیا گیا۔

غرض دنیا میں ایسے موذی انسان بھی گزرے ہیں جو صرف شغل کے طور پر دوسرے انسانوں کو بڑے بہیمانہ طریقے سے زندگی سے محروم کرتے رہے ہیں۔

رافعہ سلطانہ

سگے بہن بھائیوں میں نفرت

بظاہر یہ بات ناممکن نظر آتی ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان سے بیک وقت محبّت بھی کرتا ہو اور نفرت بھی مگر یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ ایک ہی انسان کے جذبات متضاد ہو سکتے ہیں۔ مثلاً ایک لڑکی حامدہ اپنے ننھّے منے بھائی محمود سے محبت کرتی ہے مگر بعض اوقات جب اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ امی محمود کی طرف زیادہ متوجہ ہیں تو اس کا جی یہ بھی چاہنے لگتا ہے کہ ننھے کو اٹھا کر باہر پھینک دے تاہم لڑکی سے اگر یہ پوچھئے کہ آیا وہ اپنے ننھے بھائی سے نفرت کرتی ہے؟ تو وہ ہرگز یہ اقرار نہیں کرے گی کہ اسے محمود سے نفرت ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ نفرت ایک منفی جذبہ ہے جسے انسان عموماً خود سے بھی چھپایا کرتا ہے۔

جہاں تک بچوں کا تعلق ہے۔ ان میں والدین نیز بھائی بہنوں کی طرف سے منفی جذبات ہوا کرتے ہیں۔ خاص کر بھائیوں بھائیوں میں وقتی نفرت کا جذبہ ضرور پایا جاتا ہے۔ اسی طرح ایک ماں یا ایک باپ کی بیٹیاں بھی آپس میں ایک دوسرے سے نفرت کرتی ہیں۔ بہنوں بہنوں میں جتنی شدید لڑائیاں ہوتی ہیں بھائیوں اور بہنوں میں اتنی شدید نہیں ہوا کرتیں۔

اگر کسی لڑکے کے بعد لڑکی ہو یا لڑکی کے بعد لڑکا ہو تو بڑا لڑکا یا بڑی لڑکی اپنے بعد کے بچے سے نفرت نہیں کرے گی، کیونکہ ہر چند وہ یہ سمجھے گی کہ اس کے والدین اس بچے کو چاہتے ہیں مگر اس خیال سے مطمئن رہے گی کہ میرا اس کا کوئی مقابلہ نہیں ہے لیکن اگر ایک لڑکے کے بعد دوسرا بھی لڑکا ہو تو ان دونوں میں برادرانہ محبت کے باوجود نفرت اور رقابت ضرور ہو گی۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے۔ کہ ماں باپ اس بات کا اظہار کر دیتے ہیں کہ وہ ان سے یکساں خوبیوں کے مظاہرے کی توقع رکھتے ہیں اور اس طرح وہ نادانستہ ان میں مسابقت کی دوڑ شروع کرا دیتے ہیں۔

اسی طرح بڑی بچی اپنے بعد کی بچی سے حسد کرنے لگتی ہے کیونکہ اس کی ماں اپنے طرزِ عمل سے اپنا یہ رجحان ظاہر کرتی رہتی ہے کہ وہ ان دونوں کو ایک سی خوبیوں کی لڑکیاں دیکھنا چاہتی ہیں۔

ایک کالج کی طالبہ نے، جس کی عمر بیس سال کی تھی ایک ماہر نفسیات سے یہ اعتراف کیا کہ میں اپنی چھوٹی بہن سے نفرت کرتی رہی ہوں کیونکہ وہ مجھ سے زیادہ خوبصورت ہے۔ ہمارے گھر میں جو کوئی آتا ہے وہ اس کی خوبصورتی کی تعریفیں کرتا ہے اور مجھے اس قسم کی تعریفوں کا ہر فقرہ اپنی توہین محسوس ہوتا ہے۔

اس لڑکی کی زندگی چھوٹی بہن سے نفرت کرنے کی وجہ سے خراب ہوتی رہی۔ البتہ جب اس کے ذہن نے اسے یہ نکتہ سمجھایا کہ وہ محنت اور کوشش سے قابلیت پیدا کرے تو چھوٹی بہن سے آگے نکل سکتی ہے۔ اس کے بعد اس کی ذہنی حالت بدل گئی اور وہ اپنی چھوٹی بہن کے ساتھ محبت سے پیش آنے لگی۔ چنانچہ اب اس کا ذہن معمول کے مطابق کام کرنے لگا۔

اگر والدین اس بارے میں تھوڑی سی احتیاط برتیں تو ان کے بچے اس قسم کے جذبات کا شکار ہونے سے محفوظ رہ سکتے ہیں اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ والدین کو کسی ایک بچے کو خصوصی توجہ کا مرکز نہیں بنانا چاہیئے۔ اور نہ اپنے روّیے سے یہ ظاہر کرنا چاہیئے۔ کہ وہ کسی ایک بچے کو اوروں پر ترجیح دیتے ہیں یا کسی ایک بچے کی کامیابی سے جتنے زیادہ

(باقی برصہ)

افسانہ

سعیدہ افضل

پھول مرجھا گیا

زمیندارنی عین جوانی میں مرگئی۔ ارد گرد کے دیہات کے سینکڑوں لوگ اکٹھے ہوئے۔ اگرچہ اس زمیندارنی کا شہر میں انتقال ہوا۔ لیکن زمیندار صاحب کو دیہات کے لوگ اپنا سردار مانتے تھے۔ دُور دراز سے جنازہ میں شرکت کیلئے آئے۔ شہر کے لوگ حیران تھے کیونکہ جنازہ کے ساتھ اتنا بڑا ہجوم بہت کم دیکھا گیا تھا۔ لوگوں کے چہروں پر اداسی ٹپک رہی تھی زمیندار صاحب تو بوڑھے ہو چکے تھے وہ چل بھی نہیں سکتے تھے۔ اس لئے جنازے میں شریک نہیں تھے۔ اپنی محبوب بیوی کو گھر ہی سے رخصت کر کے اپنے کمرے میں مغموم و ملول چلے گئے۔

اس جنازے میں سب سے آخر میں سرفراز سر جھکائے جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے۔ لیکن اس کا رواں رواں گریہ کناں تھا

سرفراز کے ماں باپ شہر سے دور ایک گاؤں میں قیام پذیر تھے گاؤں کی فضا میں رہ کر اس نے تعلیم حاصل کی۔ قریب ہی ایک بڑا گاؤں تھا وہاں اس نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس کے دل میں یہ جذبہ موجزن تھا۔ کہ کسی طرح وہ کالج میں جائے۔ اس کا باپ ایک معمولی سا کاروبار کرتا تھا۔ ان کے لئے زندگی کی حقیقت اس کے سوا کچھ اور نہ تھی کہ وہ دن رات محنت کریں۔ وہ ایک چھوٹے سے گھر میں رہتے تھے۔ اور ایک ہی کمرے میں گزر اوقات کرتے تھے۔ ان کے رشتے دار کبھی اکثر ان کے ہاں آتے جاتے تھے۔ اور ان کا فرض ہوتا تھا کہ وہ ان کے لئے کھانے کا اہتمام کریں۔ اور رشتے دار کبھی شکریہ ادا نہ کریں۔ کیونکہ ان کے آباؤ اجداد کا یہی دستور تھا۔ صحن میں کہیں کہیں سوکھی ہوئی مرغیاں پھر رہی تھیں ایک گائے ایک کونے میں بندھی ہوئی تھی۔ دیواروں پر گوبر کے اُپلے چسپاں تھے۔

سرفراز کے ماں باپ کے لئے یہ بڑا مشکل تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو کالج میں بھجوا سکتے۔ سرفراز کا دل بجھ سا گیا۔ وہ ملول سا رہنے لگا۔ ماں کے دل میں امنگوں کا طوفان تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کا بچہ ایک دن افسر ضرور بن جائے گا۔ وہ دل ہی دل میں ہوائی قلعے بناتی تھی، سرفراز ایک دن ضرور افسر ہو گا کوٹھی میں رہے گا، موٹر کار میں پھرے گا اور پھر ہم کتنے خوش ہوں گے ـــ ماں کی آنکھوں کے سامنے وہ سارا نقشہ پھر رہا تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ اپنے بیٹے کو غمزدہ نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ کونوں کھدروں میں سے اس نے اپنا سارا زیور نکالا۔ زیور تھا ہی کتنا ٹوٹی پھوٹی چیزیں تھیں۔ اس نے پوٹلی بنا کر سرفراز کے حوالے کر دی۔

"بیٹا جاؤ۔ کالج میں پڑھو۔ اور ایک دن افسر بن کر آؤ۔"

سرفراز بڑا محنتی اور ذہین لڑکا تھا وہ جانتا تھا کہ ماں کے پاس جو کچھ سرمایہ تھا وہ اُس نے اِس کے حوالے کر دیا ہے کالج کے داخلے اور کتابوں کا اہتمام تو ہو جائے گا۔ اور کچھ مہینے تک ہوسٹل کا بھی خرچ چل جائے گا۔ لیکن وہ کسی کے ہاں ٹیوشن ضرور کرے گا۔ اس کے بغیر کام نہیں چلے گا۔

اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پوٹلی کھولی میلے کچیلے زیورات کو اس نے غور سے دیکھا۔ اس نے محسوس کیا کہ "ماں کا دل کتنا بڑا ہوتا ہے اس کے پاس جو کچھ تھا اس نے مجھے سونپ دیا۔ میں ایک دن ضرور نہ صرف یہ زیورات لوٹاؤں گا بلکہ ماں کا دل خوشیوں سے لبریز کر دوں گا۔"

بڑے شہر کے ہوسٹل میں اس کی زندگی بالکل خشک ہی رہی۔ اس کے ساتھ عموماً امیر ماں باپ کے بیٹے تھے۔ وہ شہر کی عیش و عشرت میں حصہ لینے لگے انہیں شہر کی ہوا لگی تو وہ اپنا گاؤں بھول گئے۔ ماں باپ کی طرف سے روپیہ مل جاتا تھا۔ اس لئے وہ ہر روز سینما، ہوٹل اور کلبوں میں پھرنے لگے۔ لیکن سرفراز کی آنکھوں کے سامنے وہی گاؤں تھا وہی ماں باپ وہ کسی تفریح میں حصہ نہ لیتا۔ اسے صرف اپنی کتابوں سے کام تھا۔

جب وہ دیکھتا کہ اس کے ساتھی کس طرح دولت اڑا رہے ہیں۔ تو اس کا دل کڑھتا۔ اور اسی حالت سے متاثر ہو کر اس نے "کالج کا نوجوان اور ہمارا معاشرہ" کے موضوع پر کئی مضامین لکھے اور کالج کی سوسائٹی میں پڑھے اور کالج میگزین میں بھی شائع ہوئے۔ لیکن کالج کے لڑکے اس کا مذاق اڑاتے اور اسے کہتے کہ وہ وقت کی رفتار کے ساتھ نہیں چل رہا۔ وہ اسے کہتے کہ آج زمانے کا تقاضا یہی ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ چلا جائے۔ ورنہ ہم بہت پیچھے رہ جائیں گے۔ لیکن سرفراز اس دلیل کو بالکل تسلیم نہ کرتا۔ اگر آج کا معاشرہ تباہی کی طرف بڑھ رہا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم بھی اس کے ساتھ ساتھ چل کر تباہی کے گڑھے میں جا گریں۔

اسی طرح چار برس گزر گئے اس مدت میں وہ چھٹیوں کے موقع پر اپنے گاؤں چلا جاتا اور وہاں بھی ہمیشہ ماں کی خوشنودی کو پیش نظر رکھتا۔ اور دن رات اپنی کتابوں ہی میں مگن رہتا۔

وہ دل ہی دل میں یہ سوچ رہا تھا کہ اب آخری بار وہ لاہور جیسے بڑے شہر کو الوداع کہہ رہا ہے۔ اُفوہ! لاہور کے ہنگامے روز بروز بڑھتے ہی جا رہے تھے۔ ساری دنیا ہی اس میں سمٹ کر آگئی ہے سڑکوں پہ ایک پل کے لئے بھی چین نہیں۔ شور و غوغا، ہاؤ ہُو۔ اُف۔ رات بھر موٹریں چلتی ہیں ــــ سرفراز دل میں سوچتا "رات بھر کون لوگ ہیں جو پھرتے ہیں؟ یہ کرتے کیا ہیں؟ یہاں ہوتا کیا ہے؟

سرفراز کو کوئی جواب نہ ملتا۔ وہ خاموش ہو جاتا۔ اور اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنے لگتا۔ اس نے سوچا کہ وہ ایم۔ اے کا امتحان پرائیویٹ دے گا اور پھر مقابلے کا امتحان بھی دے گا۔ گاڑی میں وہ عجیب قسم کے منصوبے بناتا رہا۔

وہ اپنے گاؤں کے اسٹیشن پر پہنچ گیا۔ کچھ اندھیرا ہو چکا تھا۔ اسٹیشن اور اس کے گاؤں کے درمیان صرف چند کھیت ہی تھے وہ اپنا ہلکا سا بستر اور اٹیچی اٹھائے پگڈنڈی پر ہو لیا۔

گھر کا نقشہ اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ اس کا چھوٹا بھائی حشمت میٹرک میں پڑھتا ہے۔ وہ مدرسے کا کام کر رہا ہوگا۔ چھوٹے بچے نانی اماں کو کہانی سنانے کے لئے تنگ کر رہے ہوں گے۔ اس کی ماں نماز پڑھ کر مصلّے پر بیٹھی ہوئی وظیفہ کر رہی ہوگی۔ وہ وظیفے صرف اس کے لئے کرتی ہے تاکہ وہ افسر بن جائے۔ اس کی چچی بھی ان کے ہاں مقیم تھی۔ کیونکہ ان کا چچا شہر میں کسب معاش کے لئے گیا ہوا تھا۔ اس کا باپ بھی کسی دوسرے شہر میں چلا گیا تھا۔ تاکہ وہاں محنت مشقت سے کچھ کما سکے۔ اس کی چچی چھپر کھٹ کے نیچے بیٹھی بیٹھی جب تنگ آجاتی تھی تو باہر صحن میں پسینہ خشک کرنے کے لئے آجاتی تھی اب وہ باہر ٹہل رہی ہوگی۔

سرفراز کی آنکھوں کے سامنے یہی مناظر تھے۔ کہ وہ گاؤں میں پہنچا۔ بچوں نے اس کی آمد پر شور مچا دیا۔ سب کے چہروں پر عجیب قسم کی خوشی تھی۔ ماں بھی جلدی سے وظیفے سے فارغ ہوئی۔ اور اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ اس کی آنکھیں بھی مسکرا رہی تھیں۔ چچی بھی بڑی خوش نظر آتی تھیں۔ سرفراز نے دل میں سوچا۔ کہ کوئی خاص ہی بات ہے۔

جب وہ کھانے سے فارغ ہوا تو اسے اس غیر معمولی مسرت کی وجہ کا علم ہو گیا۔ اس کی شادی کے لئے بات چیت ہو رہی ہے۔ بلکہ کسی حد تک معاملہ طے بھی پا گیا ہے۔ قریب ہی دوسرے گاؤں میں ایک لڑکی ہے بڑی خوبصورت، کیا ہوا جو اس کا باپ بہت ہی غریب ہے۔ سرفراز کی ماں اپنے اس بیٹے کے لئے خوبصورت ہی بہو لائے گی۔ کیونکہ وہ افسر بننے والا ہے۔

سرفراز کا باپ شہر میں تھا۔ اور ابھی اس کی ماں نے اسے اطلاع نہیں دی تھی۔ وہ اپنے چھوٹے بیٹے حشمت کو اس کے پاس نہیں بھیجنا چاہتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ سرفراز کا باپ بگڑ جائے گا۔ اس کی طبیعت میں غصہ زیادہ ہے۔ وہ اسے خط بھی نہیں لکھنا چاہتی تھی۔ ابتدائی بات چیت میں کوئی ہرج نہیں۔ آخری فیصلہ تو سرفراز کا باپ ہی کرے گا۔ اس سے

فیصلے کے بغیر کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ اس کی ماں نے اپنی زندگی میں کوئی قدم بھی اپنے شوہر کے فیصلے کے بغیر نہیں اٹھایا تھا۔ البتہ وہ سرفراز کا انتظار کر رہی تھی۔ ایک بار لڑکی کے باپ کے ہاں جانا ضروری ہے تاکہ وہ لڑکے کو بھی تو ایک نظر دیکھ لیں۔

سرفراز نے دبی زبان میں ماں کو سمجھانے کی کوشش کی۔ کہ جب تک وہ کسی جگہ ملازم نہ ہو جائے شادی مناسب معلوم نہیں ہوتی۔ لیکن اس بات پر ماں کے چہرے پر اچانک اداسی چھا گئی۔ اس نے کہا۔

"بیٹا۔ میں جو کچھ کر رہی ہوں ٹھیک کر رہی ہوں۔ لڑکی بڑے غریب ماں باپ کی بیٹی ہے وہ میرے ہاں بھی گزارا کر سکتی ہے۔ اور اللہ نے چاہا تو تم بہت جلد افسر بن جاؤ گے"

سرفراز کسی قیمت پر بھی اپنی ماں کا دل نہیں دکھانا چاہتا تھا۔ اس کی زندگی میں صرف ماں ہی ماں تھی۔ جس کا مقام اس قدر بلند تھا کہ اسے کوئی اور چیز نظر نہیں آ سکتی تھی۔

لڑکی والوں کے ہاں پیغام بھجوا دیا گیا۔ دوسرے دن سرفراز، اس کا چھوٹا بھائی اور اس کی ماں قریب ہی گاؤں میں گئے۔

سرفراز کو اس رشتے میں صرف دو باتوں کے متعلق آگاہ کر دیا گیا تھا۔ پہلی بات تو یہ کہ اس کا باپ بہت ہی غریب ہے۔ اور دوسری بات یہ کہ لڑکی انتہائی حسین ہے۔

پہلی بات کا تو فوراً علم ہو گیا۔ جس کمرے میں انہیں بٹھایا گیا۔ وہاں دو بوسیدہ سی چارپائیوں پر پرانی چادریں بچھا دی گئی تھیں کمرے میں اور کچھ نہ تھا۔ نیز لڑکی کا باپ اس قدر عاجزی اور انکساری سے کام لے رہا تھا گویا وہ ان کے پاؤں تلے بچھ ہی جائے گا۔ غریب اور مفلس ہی اس قدر عاجزی سے کام لیتے ہیں۔ سرفراز کے نزدیک افلاس اور غربت کوئی عیب نہیں اس کے ماں باپ کون سے امیر ہیں۔ وہ بھی تو اتنے ہی غریب ہیں۔

جو کچھ بھی ان سے بن پڑا۔ انہوں نے مہمانوں کو کھلایا پلایا۔

سرفراز اب دوسری بات کے لئے بے تاب تھا۔ کافی دیر انتظار کے بعد کوئی ایسا طریقہ اختیار کر ہی لیا گیا جس سے سرفراز نے لڑکی کو ایک بھرپور نظر سے دیکھ ہی لیا۔ دوسری بات نہ صرف سچی تھی بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ۔ لڑکی کے حسن کا بیان الفاظ میں نہیں سما سکتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بیابان میں ایک تالاب ہے۔ اور اس تالاب میں صرف ایک ہی کنول کا پھول کھلا ہوا ہے۔ لباس بہت معمولی تھا۔ لیکن وہ پریوں کی شہزادی معلوم ہو رہی تھی۔ حسن میں اتنی کشش، معصومیت اور روحانی جذبہ بھی ہو سکتا ہے؟ سرفراز کے دل میں وہ تصویر کھب گئی۔ محلوں کی ملکہ غریب کی کٹیا میں پیدا ہوئی۔ سرفراز کو یوں محسوس ہوا کہ وہ ایک تنہا ستارے کی مانند ہے۔ جو اپنے اندر شفق کی سرخیاں سمیٹے ہوئے ہے۔ اور اس کی آنکھوں میں سمندر کی پر اسرار گہرائیاں موجود ہوں۔

اس کا نام ثریا تھا۔ لیکن ثریا کے ستارے اس کے سامنے بے معنی ہو کر رہ گئے تھے۔ اس کی عمر تیرہ چودہ برس سے زیادہ نہ ہوگی۔ ثریا کا باپ بہت خوش تھا کہ سرفراز اور اس کی ماں نے اس کی بیٹی کو پسند کیا ہے۔ جب وہ انہیں وداع کرنے لگا تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ ہواؤں میں اڑ رہا ہے۔

سرفراز جب اپنے گاؤں واپس آ رہا تھا تمام راہ صرف ثریا کی صورت اس کے سامنے تھی۔ اندھیرا چھا گیا تھا۔ لیکن سرفراز کے سامنے ثریا کا درخشاں حسن اس کی رہنمائی کر رہا تھا۔ وہ اس کے دل و جان میں سما گئی تھی۔

گھر پہنچ کر سرفراز کے چھوٹے بھائی حشمت نے ثریا کا کئی بار ذکر کیا۔ لیکن سرفراز کی آنکھوں کے سامنے جو تصویر گھوم رہی تھی اس کے لئے اس کے پاس الفاظ نہیں تھے۔ سرفراز نے ثریا کی آنکھوں سے زندگی کا جو پیغام سنا تھا وہ بیان نہیں ہو سکتا تھا۔

غیر متوقع طور پر اچانک سرفراز کا باپ بھی وارد ہو گیا سرفراز کی ماں نے آہستہ آہستہ موقع محل دیکھتے ہوئے رشتہ کی بات اس کے کانوں تک پہنچائی اور ساتھ ہی ثریا کے حسن و جمال کی اپنے الفاظ میں تعریف کی۔ سرفراز کا باپ کاروباری آدمی تھا اس کا خیال تھا کہ حسن و عشق سب بے معنی چیزیں ہیں۔ اصل چیز دولت ہے۔ لڑکی بدصورت ہو لیکن امیر باپ کی بیٹی ہو۔ اور بے اندازہ جہیز اپنے ساتھ لائے لیکن جب اس نے سنا کہ ثریا کا باپ بالکل غریب ہے تو اس نے اس رشتہ کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا۔ اب ان کے ہاں ہر روز لڑائی رہنے لگی سرفراز کی

ماں تو ثریا کے باپ کو قول دے چکی تھی۔ بھلا اب منہ کیسے پھیرا جا سکتا ہے
سرفراز کا دل بیٹھ گیا۔ چند دنوں کے لئے مسرتوں کا انبار اس کے سینے میں لگ گیا تھا۔ اب اسے مایوسی کی گھٹائیں نظر آ رہی تھیں۔ جو بجلی بن کر اس پر گریں۔

ایک دو دن کے بعد سرفراز کا چچا بھی آگیا۔ اس نے سرفراز کی ماں سے کہا "بہن یہ ہمارے بھائی صاحب تو بالکل کاٹھ کے اُلو ہیں۔ میں سارا معاملہ سیدھا کر لوں گا۔ تم کوئی فکر نہ کرو!"

خدا جانے اس نے سرفراز کے باپ کے کان میں کیا کہا کہ وہ خاموش ہو گیا۔

آخر شادی کا دن آگیا۔ سرفراز کے گھر میں کافی چہل پہل تھی۔ برات بڑی مختصر تھی۔ اور وہاں ثریا کے گھر بھی انتظامات بڑے غریبانہ تھے۔ ایک بوسیدہ سا شامیانہ لگا ہوا تھا۔ کھانا بھی بڑا معمولی سا تھا لیکن سرفراز کی آنکھوں کے سامنے صرف ثریا گھوم رہی تھی۔ وہ ایسی باتوں کی طرف مطلق توجہ نہیں دے رہا تھا۔

جب دولہن تیار ہو گئی تو سرفراز کا باپ اور چچا دونوں اندر گئے۔ دولہن کو دیکھا پھر آپس میں سرگوشی کرنے لگے۔ باہر آ کر مردوں میں پھر بیٹھ گئے۔ ان کے چہرے پر غصہ تھا۔ سرفراز کے چچا نے دولہن کے باپ کو بلایا اور کہا۔
"بھائی زیورات کہاں ہیں؟"

ثریا کے باپ نے ہاتھ باندھ کر کہا "زیور تو صرف وہی چاندی کے ہیں جو میری بیٹی نے پہن رکھے ہیں"

سرفراز کے چچا نے کہا "میاں صاحب۔ کیا آپ ہم سے مذاق کر رہے ہیں؟"

ثریا کے باپ نے پھر کہا "میں مذاق نہیں کر رہا۔ میں بڑا غریب آدمی ہوں۔ میرے پاس تو صرف یہی زیور تھا"

اس پر سرفراز کے چچا نے گرج کر کہا "کمال ہے ایک لکھا پڑھا دولہا ہم اپنے ساتھ لائے ہیں۔ تم کچھ اور جہیز میں نہیں دیتے تو کم از کم آٹھ دس تولے سونے کے زیورات تو ضرور ہوتے۔ نہ دولہا کے لئے گھڑی ہے"

ثریا کے باپ نے اپنی پگڑی اتار کر سرفراز کے باپ کے پاؤں پر رکھ دی اور کہا "میری عزت اب آپ کے ہاتھ میں ہے۔ میں غریب آدمی ہوں میں کہیں کا نہیں رہوں گا۔ ساری برادری مجھے دھتکار دے گی۔ یہ بیٹی کا دکھ ہے چوہدری جی۔ آپ کے گھر والوں نے کہا تھا کہ ہمیں جہیز نہیں چاہیئے"

سرفراز کے چچا نے کہا "آپ جھوٹ کہتے ہیں کسی نے یہ نہیں کہا تھا۔ تم کیا سمجھتے ہو ہمارے بیٹے کو کوئی لڑکی نہیں مل سکتی"

ثریا کے باپ کے مہمانوں میں سے ایک نے بلند آواز میں کہا۔
"عجیب لوگ ہیں یہ۔ باپ کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے وعدے سے پھر گئے ہیں۔ بھائیو! تم ایک غریب کی مٹی پلید نہ کرو"

اس پر سرفراز کا چچا چیخ کر کہنے لگا "ہم یہاں ایک پل بھی نہیں ٹھہریں گے۔ ہماری بے حد توہین ہوئی ہے۔ ایک تو جہیز نہیں دوسرا ہمیں بُرا بھلا کہا گیا"

یہ کہہ کر تمام براتی اٹھ کھڑے ہوئے۔ سرفراز کے چچا نے اس کو کھینچ کر باہر کی طرف گھسیٹا اس کا سہرا بھی زمین پر گر گیا۔

ثریا کے باپ کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ وہ اسی طرح ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔ اس کی پگڑی کو مسلتے ہوئے سرفراز کا چچا باہر نکل آیا جب یہ دھما چوکڑی مچی ہوئی تھی۔ تو سرفراز خاموشی سے کھسک گیا۔ اور اندر کی طرف جھانکا۔ ثریا کی آنکھوں میں آنسو خشک ہو گئے تھے۔ صرف التجا ہی التجا تھی۔ اس نے سرفراز کی طرف ایک ہرنی کی طرح دیکھا جو زخمی ہو چکی ہو اور شکاری اسے اٹھائے لئے جا رہے ہوں۔ اس کی نگاہوں میں شکست خوردہ محبت کی بجھی ہوئی شعاعیں نکل رہی تھیں۔ پہلی ہی محبت میں وہ مات کھا گئی۔

سرفراز کے دل میں ثریا کی محبت نے جوش مارا۔ وہ اپنے چچا کو نیچا دکھانا چاہتا تھا کیا وہ محض ایک مٹی کا مادھو ہے جس کو اس کا چچا استعمال کر رہا ہے؟ ہرگز نہیں"

دوسرے لمحے دو آدمی قریب سے گزرے۔

ایک نے کہا "بے چارہ غریب باپ کہاں سے جہیز لاتا۔ بڑے زمیندار تھے ہی تو آواز بلند کی تھی"

دوسرے نے کہا "اس نے اسی وقت کہہ دیا کہ ثریا کی شادی آج ہی ہو گی۔ اگر براتی واپس چلے گئے ہیں تو کیا ہوا ہے میں شادی کروں گا"

پہلے نے کہا "بے چاری کے پاس جہیز کے لئے سونے کا ایک زیور بھی نہ تھا۔ اور اب سونے اور ہیرے جواہرات میں لد جائے گی"

وہ سرت نے کہا "کیا ہوا جو زمیندار بوڑھا ہے۔ بہت بڑی زمیندارنی بن کر زندگی بسر کرے گی۔"

سرفراز نے جب یہ باتیں سُنیں تو وہ سر جھکا کے باہر نکل آیا براتیوں کے تانگے جُت چکے تھے۔ سرفراز بھی اپنا دل خون کر کے ایک تانگے میں بیٹھ گیا۔ اس ہاؤ ہُو میں کسی نے بھی یہ محسوس نہ کیا کہ سرفراز تھوڑی دیر کیلئے کھسک گیا تھا۔

سرفراز سے اپنی ماں کی حالت نہ دیکھی گئی۔ وہ برابر گریہ وزاری کرتی رہی۔ اس نے ثریا کے باپ کو قول دیا تھا وہ قول ہار گئی۔ کتنا بڑا گناہ ہے یہ۔ سرفراز دوسرے ہی دن واپس لاہور چلا گیا۔ اب اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ کبھی گاؤں نہیں آئے گا۔ اس کا دل بجھ چکا تھا۔ اس کی آرزوئیں پاؤں تلے مسلی جا چکی تھیں۔ ثریا اسے نہ مل سکی۔

امتحان میں وہ پاس تو ہو گیا۔ لیکن سراسیمگی اور مایوسی کی انتہا ہو چکی تھی۔ کسی مقابلے کے امتحان کا ارادہ ترک کر دیا۔ اور ایک سکول میں ملازمت کر لی۔

چند ماہ بعد سرفراز کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ اب اس کی ماں اور بھائیوں کے لئے گاؤں میں رہنا مشکل ہو گیا۔ سرفراز نے لاہور ہی میں مکان کرایہ پر لے لیا۔ اور ماں اور بھائیوں کو وہیں بلا لیا۔ ان کے مکان کے ساتھ ہی ایک بڑی عالی شان عمارت تھی جس کی بالائی کھڑکیاں باہر کی طرف کھلتی تھیں۔ سرفراز ہی سارے کنبے کا سہارا تھا وہ دن کو سکول جا کر پڑھاتا۔ اور شام کو ٹیوشن لیتا۔ وہ دن رات کام کرنے لگا تاکہ سارے کنبے کی بسر اوقات ہو سکے۔

ایک دن اس عالی شان عمارت میں بہت زیادہ رونق نظر آنے لگی رنگ برنگ قمقمے، رنگین جھنڈیاں، ڈھول باجا، اور رقص و سرود کی آوازیں دور دور تک سنائی دیتی تھیں۔ سرفراز جب سکول سے واپس آیا تو اسے اس عمارت کے ایک ملازم نے بتایا۔ کہ بڑے زمیندار کے پوتے کا عقیقہ ہے۔ اس لئے یہ سارا اہتمام کیا جا رہا ہے۔

اتنے میں اوپر سے کھڑکی کھلی۔ سرفراز کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آتا تھا۔ وہی — بالکل وہی — "ثریا یہاں کیسے؟"

اس نے پھر عمارت کے ملازم سے پوچھا۔ تو اسے یقین ہوا۔

اسے بتایا گیا کہ بڑے زمیندار صاحب اپنے علاج کیلئے گاؤں سے یہاں آ گئے ہیں۔ دو برس ہوئے ان پر فالج کا حملہ ہوا تھا۔ اب پلنگ سے نہیں اُٹھ سکتا۔ انہوں نے اپنے گاؤں کی ایک لڑکی سے شادی بھی کی تھی وہ بھی بے چاری اندر ہی اندر گھل گھل کر کچھ بیمار سی ہو گئی ہے۔ کہتے ہیں کہ اسے پرانا بخار ہے۔

سرفراز نے دیکھا کہ وہی ثریا، زیورات سے لدی پھندی ثریا، اعلےٰ ترین لباس میں ملبوس ہے۔ لیکن آنکھوں کی وہ معصومیت ختم ہو چکی تھی۔ وہ کچھ دیر تک سرفراز کو دیکھتی رہی اور پھر کھڑکی بند ہو گئی، سرفراز مایوسی کی انتہائی گہرائیوں میں ڈوب گیا۔

سرفراز کی ماں نے اپنے بیٹے کو بہت سمجھایا۔ کہ وہ شادی کرے۔ لیکن سرفراز عہد کر چکا تھا کہ وہ شادی نہیں کرے گا۔ اس کے سینے میں ثریا کا زخم کبھی مندمل نہیں ہو سکتا تھا۔ ماں کو صرف اس نے اس پہلو پہ سمجھایا کہ اس کے ذمے سارے کنبے کی دیکھ بھال ہے اس لئے وہ شادی نہیں کر سکتا — سرفراز نے دوبارہ کبھی اس کھڑکی کی طرف نہیں دیکھا اب اس کا اور ثریا کا ملاپ بالکل ہی ناممکن ہے۔ وہ بہت بڑی بیگم بن گئی ہے اور سرفراز ایک مفلس سکول ماسٹر۔ سرفراز کے چھوٹے بھائی حشمت نے ایم اے پاس کر لیا تھا۔ اس کی ماں سرفراز سے مایوس ہو کر حشمت کے لئے رشتہ تلاش کرنے لگی۔ لیکن کوئی موزوں رشتہ نہیں ملتا تھا۔ سرفراز کے ساتھ والے مکان میں ایک متوسط درجے کا آدمی قیام پذیر تھا۔ اس کی لڑکی جوان تھی۔ لیکن خوبصورت نہ تھی۔ اس کا رشتہ ایک نوجوان سے طے پا گیا۔ شادی کی تیاری ہونے لگی۔ آخر شادی کا دن آ گیا۔ مکان پر جھنڈیاں لگائی گئیں۔ ٹہنیوں اور شاخوں سے ایک دروازہ بنایا۔ سرفراز کو ٹیوشن کیلئے ضرور جانا تھا اس لئے وہ تو چلا گیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ رات کے وقت نکاح میں شامل ہو جائے گا۔ سرفراز جب واپس آیا تو وہ دیکھ کر حیران رہ گیا براتیوں میں شور و غوغا برپا تھا دولہا کا باپ دولہن کے باپ کو بُرا بھلا کہہ رہا تھا۔ اور اس نے یہ اعلان کر دیا کہ برات واپس چلی جائے گی۔

سرفراز کی آنکھوں کے سامنے وہی منظر آ گیا جبکہ اس کی شادی ثریا سے ہونے والی تھی۔ ہمسایہ بھی غریب تھا اور وہ اپنی بیٹی کو لڑکے والوں کی خواہش کے مطابق جہیز نہ دے سکا تھا اس لئے برات واپس جا رہی تھی

دولہن کے باپ کی حالت دیکھی نہ جا سکتی تھی۔ غریب ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ لیکن اس پر کسی نے بھی ترس نہ کھایا۔ جب دولہن کو معلوم ہوا تو وہ عروسی لباس سمیت زمین پر لوٹتے لوٹتے بے ہوش ہو گئی۔

برات واپس چلی گئی۔

اگر آج اس لڑکی کی شادی نہ ہوئی تو وہ بے چاری ہمیشہ کے لئے دھتکاری جائے گی۔ اسی اثنا میں سرفراز نے دیکھا کہ ایک نوجوان آگے بڑھا اس نے کہا۔

"بابا! کیوں دل چھوٹا کرتے ہو۔ میں تمہاری بیٹی سے شادی کرونگا"

یہ سرفراز کا چھوٹا بھائی حشمت تھا۔

اچانک دولہن کے باپ کے چہرے پر زندگی کی سرخی دوڑ گئی۔ وہ گھر جو جس پر مایوسیوں کے بادل چھا گئے تھے۔ آن واحد میں پھر وہاں شادیانے بجنے لگے۔

میرے چھوٹے بھائی نے میری زندگی کا بہت بڑا بوجھ ہلکا کر دیا کاش میں جرأت سے کام لیکر اپنے آپ کو پیش کر سکتا۔

شادی کی رسوم ختم ہوئیں تو حشمت دولہن کو لے کر اپنے مکان میں آیا۔ سرفراز کی ماں نے دروازہ کھولا۔ تو وہ ششدر رہ گئی۔ وہ اپنے بیٹے کو اپنی مرضی کے مطابق بیاہنا چاہتی تھی لیکن یہ کیا ہوا۔ اس کے چہرے پر غصے کے آثار پیدا ہوئے۔ دولہن کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ لیکن نگاہیں زمین پر گڑی ہوئی تھیں۔

سرفراز آگے بڑھا اور کہا "ماں ان دونوں کو اپنے سینے سے لگا کر دعائیں دو۔ حشمت نے وہ کام کیا ہے جو ہم سب کے لئے قابل فخر ہے اور جو گناہ ہم سے سرزد ہوا تھا۔ اس کا کفارہ حشمت نے ادا کر دیا ہے۔"

گھر میں خوشی کے شادیانے بجنے لگے۔ دوسرے دن محلے کی تمام عورتیں وہاں اکٹھی ہوئیں سب نے سرفراز کی ماں کو مبارکباد دی کہ اس کے بیٹے نے ایک غریب باپ کی عزت کو مٹی میں ملنے سے بچا لیا۔ سرفراز دوسرے دن ذرا دیر سے گھر پہنچا۔ اس خیال سے کہ اب وہاں عورتوں کا ہجوم نہ ہوگا اس نے دیکھا کہ کمرے کے دروازے میں ایک عورت کھڑی ہے۔ بیحد قیمتی لباس پہنے ہوئے۔ اس کی پشت سرفراز کی طرف تھی وہ ٹھٹک کر وہیں کھڑا ہو گیا۔ سرفراز پہچان چکا تھا کہ وہ ثریا ہے۔

ایک ملازمہ نے کہا "کہاں ہے دولہن، ہماری بیگم صاحبہ اسے دیکھنا چاہتی ہیں"

سرفراز کی والدہ گھر پر نہ تھیں اس کی چھوٹی بہن اسے اندر لے گئی۔ اس نے اپنی نوکرانیوں کو باہر جانے کو کہا۔ اور دولہن سے کہا۔

"اپنی نقاب اٹھاؤ دولہن۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ تم کتنی خوبصورت ہو۔ کیا تم مجھ سے زیادہ حسین ہو۔ وہ مجھے چھوڑ آیا تھا تاکہ میں عمر بھر اس کی محبت کی آگ میں خاموشی سے جلتی رہوں۔ آخر تم میں کیا ہے جو اس نے تم سے شادی کی؟ تمہارا اور میرا مقابلہ ہی کیا؟ کیا تمہارے پاس دولت زیادہ ہے؟ کیا تمہارے پاس سونے کے زیورات ہیں؟ مجھے دکھاؤ کہاں ہیں وہ ہیرے جواہرات؟" سرفراز جلدی سے اس کے سامنے آگیا دولہن خوفزدہ ہو کر سمٹی سمٹائی ایک کونے میں دبکی پڑی تھی اور ثریا کی آنکھوں سے آگ برس رہی تھی سرفراز نے کہا "ثریا" ثریا نے مڑ کر سرفراز کی طرف دیکھا ابھی تک اس کی آنکھوں سے انگارے برس رہے تھے۔ اس نے غضبناک ہو کر کہا "تم ہی بتاؤ مجھے، تمہاری بیوی تو جواب نہیں دے سکتی۔ آخر یہ لڑکی کس لحاظ سے مجھ پر فوقیت رکھتی ہے حسن، دولت یا پاکیزگی۔ کونسی خوبی مجھ سے بڑھ کر ہے"؟

سرفراز نے بڑے پرسکون لہجہ میں کہا "ثریا تم غلط سمجھ رہی ہو یہ میرے چھوٹے بھائی حشمت کی بیوی ہے میں نے تو شادی نہ کرنے کا عہد کر رکھا ہے میں تو آگ میں جل رہا ہوں" اچانک ثریا کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے انگارے پھولوں میں بدل گئے۔ اس کے چہرے پر اطمینان و سکون کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے خوشی سے چیخ مار کر کہا "یہ تمہاری بیوی نہیں ہے؟ اور تم ...؟ شکر ہے خدا" اس کی دونوں نوکرانیاں اندر آگئیں اور ثریا سرفراز کی طرف دیکھے بغیر باہر نکل گئی۔

دو برس سے ثریا کی حالت ابتر ہوتی جا رہی تھی اس کے دل و دماغ میں صرف سرفراز ہی رہتا تھا۔ سرفراز کا زخم ایکبار پھر تازہ ہو گیا لیکن اب وہ کیا کر سکتا تھا زندگی نے ایک دوسرے کو بہت دور پھینک دیا تھا۔ چند دنوں تک سرفراز اپنی مایوسیوں میں ڈوبا ادھر ادھر پھرتا رہا۔ ہر لمحہ اس کی آنکھوں کے سامنے ثریا کی تصویر تھی۔ ایک دن اسی عمارت میں ماتم کا شور پیدا ہوا معلوم ہوا کہ رات کے وقت زمیندار کی دوسری بیگم ثریا اپنے خالق حقیقی سے جا ملی۔ سرفراز اس گناہ کا کفارہ ادا نہ کر سکا۔ ثریا بازی جیت گئی یہ سوچتے ہوئے سرفراز جنازے کے پیچھے پیچھے سر جھکائے جا رہا تھا۔

ایک ننھا افسانہ

کشور عباس

جانور

.ہمارے کامن روم کی دیواریں، یہ دروازے اور یہ کھڑکیاں ہماری رازدار ہیں۔ یہ صرف لڑکیوں کے لئے مخصوص ہے۔ پھر بھی کئی ایسی کہانیاں ہیں جو یہاں سے نہ جانے کیسے نکل کر سارے کالج میں ایک افواہ کی طرح پھیل جاتی ہیں۔ ہاں تو ایک ایسی کہانی میں آپ کو سناتی ہوں۔

میں آپ کو یہ کہانی نہ بھی سناتی اس ڈر سے کہ یہ دیواریں، یہ دروازے یہ کھڑکیا ں ناراض نہ ہو جائیں۔ لیکن کل روپ، سلیم کو لے کر میرے پاس آئی تھی۔ بڑی لجائی سی، شرمائی سی، یقین مانئے حیرت کی وجہ سے میرے منہ سے کوئی جملہ نہیں نکلا۔ روپ نے ہی اپنی نظریں جھکا کر ہوئے سے کہا تھا

"ن سے ملو . . . . میرے شوہر سلیم"

گ یا میں سلیم کو پہلے سے نہیں جانتی تھی ــ تمہید کی ضرورت کیا ہے جب یہ مختصر سی کہانی حقیقت بن گئی تو اسے سنانے میں ڈر کیسا؟

❋ ❋ ❋

جیسے کوئی بم پھٹ پڑا ہو۔ کامن روم کے دروازے اپنی پوری آواز سے کھل اُٹھے، تمتماتے ہوئے چہرے کے ساتھ روپ ڈرتی ہوئی اندر گھسی اور میرے کندھوں پہ آن گری میں کرسی میں سہم کر دبک سی گئی۔ مینا نے گھبرا کر اپنی کتاب بند کر دی۔ جب روپ کی سانس کچھ ٹھہر گئی اور وہ کچھ کہنے کے قابل ہوئی تو ہم دونوں سوچ رہی تھیں کہ نہ جانے کونسی خاص بات بتائے گی مگر وہ کہنے لگی "اری چل کر تو دیکھ لے۔ ابھی ابھی ہماری کلاس میں ایک نیا جانور آ پھنسا ہے"۔

"تو یہ بھی کوئی مصیبت تھی، کہ یوں برق کی طرح آن گھسی"۔ میرا نے اپنی کتاب دوبارہ کھولتے ہوئے کہا۔

"بگلی دیکھنے کی چیز ہے اسے بار بار دیکھ مشکل سے دو گھنٹے ہی ٹھہرے گا۔ لڑکوں کے ہاتھ پڑ گیا تو ابھی گیٹ کے باہر دوڑا دیں گے۔ اور پھر تو ترستی رہ جائے گی"

آخر چیز کیا ہے۔ کہاں ہے؟" میں روپ کی ایسی ہی باتوں سے اُکتا جاتی تھی۔

"لان میں کونے پہ مالتی کی جھاڑیوں کے اس پار پڑا لمبی لمبی سانسیں لے رہا ہے؟"

"تو تو اس کو پانی کا ایک گلاس پلا آتی"۔ میرا نے جل کر کہا۔

"نہ بابا مجھے تو ڈر لگتا ہے"۔ روپ بولی "تم لوگ ساتھ چلو نا"

اور مجبوراً ہم لوگوں کو ساتھ جانا پڑا۔ ڈرتے ڈراتے آہستہ آہستہ جب ہم نے مالتی کی جھاڑیوں کو ذرا سا ہٹا کر جھانکا۔ تو وہ کچھ اپنی ڈائری میں لکھنے میں منہمک تھا۔ سفید کرتا اور پاجامہ چہرے کا عجیب سیاہ رنگ بال جیسے کبھی ان میں تیل ڈالنے کی ضرورت ہی نہ پڑی ہو۔ ایک عجیب سا وجود ہر بات سے لاپروائی عیاں، ایک لمحہ کو میں نے سوچا روپ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ "جانور" جسے اپنا کچھ ہوش ہی نہ ہو۔

دوسرے لمحے اس نے اپنی مضمحل سی آنکھیں اٹھا کر ہمیں دیکھ لیا۔ اف اس کی آنکھیں ضرورت سے زیادہ بڑی جن میں نہ جانے کتنا درد اور مایوسیاں پنہاں تھیں۔ عجیب بے کسی سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ غیر ارادی طور پر ہمارے ہاتھ سلام کے لئے اُٹھ گئے۔ اس کے موٹے موٹے خشک ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ رینگ گئی۔

ایک ایسی مسکراہٹ جیسے وہ زبردستی مسکرا رہا ہو۔ اور مسکراتے ہوئے بھی اسے تکلیف ہو رہی ہو۔ پہلے اس نے اپنی ڈائری بند کی۔ اور پھر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"آداب ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے سلیم کہتے ہیں" آواز میں ایک ٹھہراؤ تھا مردانہ وجاہت تھی۔ اس کے موتی جیسے دانت، اس کے رنگ کا مذاق اُڑا رہے تھے۔ ہم اس کی بات پر کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ سلیم کیا پُر مذاق نام ہے۔ ماں کو تو اپنا ہر ایک بیٹا شہزادہ ہی نظر آتا ہے۔ کون جانتا تھا کہ ماں وہ ماں جس کے قدموں کے نیچے سے جنت کو راستہ جاتا ہے کیا سوچ کر اپنے بیٹے کو نام دیتی ہے۔ ہماری ہنسی سے اس کی آنکھوں کی اُداسی اور بڑھ گئی تھی۔ چہرہ تاریک ہو گیا تھا۔

"آپ بنگالی ہیں؟" روپ نے گھبرا کر پوچھا۔

"ہوں تو سہی لیکن بنگال چھوڑے ایک عرصہ ہو گیا"

میں روپ کے پیچھے دبکی ہوئی کھڑی تھی۔ میرا اسے یوں دیکھ رہی تھی، جیسے کوئی عجوبہ ہو۔

"اسی لئے اردو زبان اتنی صاف بول لیتے ہیں"

"شکریہ" اس نے بڑے دھیمے سے کہا۔ اور اپنی آنکھیں جھکا لیں

میں اسی لئے حیران تھی۔ کہ روپ کی رگِ شرارت ابھی تک کیوں نہیں پھڑکی۔ بالآخر وہ پھڑک اُٹھی۔

"اگر آپ سیاہ کپڑے پہنا ہوتے تو ان مالتی کی جھاڑیوں میں آپ کو تلاش کرنا خاصا دشوار ہو جاتا" روپ مسکراہٹ چھپاتے ہوئے بولی۔ اداس آنکھیں ایک بار پھر اُٹھیں اور روپ سہم سی گئی۔

میرا نے بات ٹالنے کو پوچھا" یہاں آنے سے پہلے آپ کہاں تھے"

اس نے میرا کو دیکھا اور پوچھنے لگا" پہلے پہلی بات کا جواب دوں یا آپ کے سوال کا؟" اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔

"وہ تو شریر یونہی بکواس کرتی ہے۔ میری بات کا جواب دیں"

میرا بولی۔

"میں ڈھاکہ میوزک اسکول میں تین سال گزار کر آرہا ہوں۔ سوچا چلو تعلیم بھی مکمل کر لوں"

"میوزک ۔ ۔" روپ جیسے خوش ہو گئی "کونسا ساز بجاتے ہیں آپ"

"صرف یہ" اور یہ کہہ کر اس نے اپنی اُلٹے ہاتھ کی آستین اُلٹ دی اور ہم لوگوں کی ہنسی نکلتے نکلتے رک گئی۔ گھڑی کی اسپرنگ میں کلائی کے ساتھ ساتھ ایک بانسری اٹکی ہوئی تھی گھنٹہ بج گیا اور ہم لوگ لوٹ پڑے۔ یہ سلیم سے ہماری پہلی ملاقات تھی۔

٭ ٭ ٭

وقت گزرتا گیا۔

لڑکیوں سے دُور رہنے والا بدنما لڑکا کلاس کی لڑکیوں کے لئے ایک مستقل شغل بن گیا تھا۔ ہم لوگ رفتہ رفتہ سلیم کو پوری طرح سمجھ چکے تھے لڑکیاں اس کو گہرے طنز کے تیر برساتی رہتی تھیں لیکن سلیم کا دل واقعی بیحد حسین تھا۔ وہ اپنی برائیاں بھی یونہی مسکراتے ہوئے سن لیتا جیسے اپنی تعریفیں سن رہا ہو۔ کتنی برداشت کی قوت تھی اس میں۔ اور اس کی اسی قوت سے ہم لوگوں نے ہار مان لی تھی۔ ہم لوگ جو پہلے اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ اب اس کی عزت کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ نہ جانے کیوں وہ جب کبھی کلاس میں نہیں ہوتا تو ایک کمی سی محسوس ہوتی تھی۔

جہاں تک سنگیت کا سوال تھا سلیم ایک فنکار تھا آرٹسٹ تھا۔ اس کی بانسری کی لے میں بلا کا سوز تھا۔ کچھ دنوں بعد تو ہم یہ بھی جان گئے کہ وہ ایک ریڈیو آرٹسٹ ہے۔ وہ ٹیوشن کرتا ہے۔ جس کی آمدنی سے اس کا اپنا پیٹ اور پڑھائی کا خرچ چلتا ہے اور جو بچ رہتا ہے وہ ماں کو بھیج دیتا ہے۔ واقعی سلیم ایک عظیم روح کا مالک تھا۔ دنیا کی اور کسی بات سے اس کا تعلق نہیں تھا۔ ایسا لگتا تھا اس کی احساسِ کمتری نے اس کو گوشہ نشین کر دیا ہو۔ وہ تھا اور اس کی بانسری تھی۔

اس کی بانسری جیسے اس کے جسم کا ہی کوئی اٹوٹ حصہ ہو۔ اور مالتی کی جھاڑیوں کے پیچھے وہ گوشہ جیسے اس کی اپنی ملکیت ہو۔ خالی گھنٹوں میں کامن روم میں بیٹھے بیٹھے جب بھی ہم لوگوں کا دل کرتا مالتی کی جھاڑیوں کو پھلانگ کر اس کے پاس دھیمے سروں میں بانسری سننے پہنچ جاتے ـــــ اور ایک دن۔

جب انہی جھاڑیوں کے پیچھے سلیم تھک کر اپنی ڈائری سرہانے رکھے بے سدھ سو رہا تھا۔ میں، روپ اور میرا تینوں اس کے راگ سننے وہاں پہنچ گئیں۔ ایک "پٹ" کی آواز ہوئی اور سلیم کی آنکھ کھل گئی۔

ہاتھ کے قریب ہی اس کی بانسری ٹوٹی ہوئی روپ کے سینڈل کے تلے دبی پڑی تھی۔ ایک پل، دو پل، تین پل وہ اپنی ٹوٹی ہوئی بانسری کو گھورتا رہا۔ جیسے روپ کے سینڈل تلے تو اس کا جسم دبا پڑا ہو۔ اور جب روپ نے گھبرا کر اپنا پاؤں ہٹایا تب اس نے بڑی احتیاط سے کچلی ہوئی بانسری کے ٹکڑوں کو اکٹھا کیا۔ روپ چپ رہتی اس کے سامنے کھڑی تھی۔ سلیم نے بڑی حسرت سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ٹوٹنے والی چیز تھی۔ ٹوٹ گئی۔ کم از کم ایسی چیز کو دے دیجئے کہ میں ان ٹکڑوں کو یکجا باندھ سکوں۔"

گھبرائی ہوئی روپ بولی۔ "انہیں پھینک دیجئے نا۔ بانسری تو نئی آجائے گی۔" میں نے دیکھا سلیم کے چہرے پر ایک بادل آیا اور ماتھے پر پسینے کے قطرے چھوڑتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اس نے بڑے سکون سے جواب دیا۔

"نہیں روپ میرے ہونٹوں نے آج تک اس بانسری کے علاوہ کسی اور کو منہ نہیں لگایا۔ ان ٹکڑوں کو مجھے رکھنا ہی ہوگا۔

روپ نے بڑی خاموشی سے اپنے بالوں کا ربن نکال کر سلیم کے ہاتھوں میں دیدیا۔ اور ہمیشہ اس کا مذاق بنانے والی روپ آنکھوں میں آنسوؤں کا طوفان دبائے پلٹ پڑی۔ ہم لوگ بھی واپس آگئے۔ ایک دھیمی مدھم آواز جیسے میلوں پیچھے سے آئی۔ "شکریہ!" جیسے آنسوؤں میں ڈبو کر کوئی لفظ ہوا میں پھینک دے۔

اس کامن روم میں آکر روپ مجھ سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔ یہ دیواریں یہ دروازے یہ کھڑکیاں یونہی خاموش کھڑے اسے دیکھتے رہے تھے۔

ایک اتنا سا حادثہ۔ سلیم ہم سے کوسوں دور رہا پڑا تھا روپ کی ساری شوخی شرارت جیسے ختم ہو گئی تھی۔ امتحان کے آخری دن تھے میں کامن روم سے نکل کر ڈیپارٹمنٹ کی طرف جا رہی تھی۔ لائبریری کے سامنے اداس سلیم کھڑا تھا۔ اس نے ہولے سے پکارا

"سنئیے!"

میرے آگے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ وہ باوقار چلتا ہوا میرے پاس آیا۔ ہاتھ میں ایک ننھا سا لفافہ تھا۔ میں نے اس کی شکل دیکھی، لگتا تھا۔ اب رو دے گا۔ کہنے لگا۔

"آپ روپ کی دوست ہیں نا۔ آپ اس سے کہہ دیجئے گا میں جہاں ہوں، وہیں ٹھیک ہوں۔ خدا کے لئے میرا مذاق نہ اڑائیے۔" ایک پل وہ رکا۔ اور پھر وہ لفافہ میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولا "یہ اس کی امانت ہے۔ اسے واپس کر دیجئے گا۔"

اتنا کہہ کر لائبریری کی طرف مڑ گیا۔ میں خاموش دیکھتی رہ گئی۔ جانے کیوں مجھے روپ پر غصہ آیا اور سلیم پر رحم۔ لفافہ کھول کر دیکھا۔ ایک تصویر تھی میری خوبصورت سہیلی روپ کی۔ اور اس کے پیچھے لکھا تھا:-

"کاش میں تیری بانسری بن سکتی روپ"

٭ ٭ ٭

کل جب سلیم اور روپ میرے پاس آئے تو میں حیران و ششدر رہ گئی تھی۔ اور آج میں بڑی بے تابی سے اس کامن روم میں روپ کا انتظار کر رہی ہوں۔ کل اسے جلدی تھی۔ آج اس نے یہیں آنے کو کہا تھا۔ ورنہ یہ کہانی حقیقت کیسے بنی۔ آپ کو کیسے بتاؤں!

یہ دیواریں، یہ دروازے، یہ کھڑکیاں، خاموش کمرہ، راز جاننے کو بیتاب ہیں۔ میں سوچ رہی ہوں۔ جب وہ آئے تو اسے مسز سلیم کہوں یا مسز جانور۔

مگر وہ ابھی تک نہیں آئی۔

(بقیہ ص۳۲)

کس قدر حسین لگتی ہیں آپ؟"

"ابھی نہیں۔ شام کو جب ساتھ مل کر "ہل پارک" گھومنے جائیں گے تب دیکھ لینا۔"

"اف خدایا۔ ابھی تو شام کی سیر کا بھی پروگرام ہے...؟ لیکن اس وقت تو تم ان میلے کچیلے کپڑوں میں بھی مجھے دلکش لگ رہی ہو کہیے۔ میکے جانے کا ارادہ ہے یا ملتوی؟"

"ملتوی۔ شریر کہیں کے۔ بڑے چالاک ہو۔ اور بلا کے باتونی بھی!"

(گجراتی سے)

افسانہ

آنسہ زیب گلشن مولوی کراچی

لا "مارشل" ـــ لا

"اجی سنتے بھی ہو یا نہیں ؟"

" سننے کے لیئے تو اللہ پاک نے دو کان دیئے ہیں ۔ اور پھر اس کے فضل سے ہیں بھی صحیح سلامت ۔ لیکن تم جو ہر وقت چیختی چلاتی رہو گی تو کسی دن تمہاری یہ تلوار کی سی تیز آواز کانوں کے پردے چیر کر رکھ دیگی"

" واہ صاحب واہ ۔ اپنی لسّانی رکھئے اپنے پاس ۔ آئے بڑے برجستہ کہنے والے ۔ آپ کے کان سلامت ہیں تو ہمہ تن گوش ہو کر سُن لیجئے کہ آج سے آپ کی تمام فضول خرچیاں بند ـــ سمجھے ؟"

"اچھا یہ حکم تو آج تم اس طرح سنا رہی ہو جیسے مارشل لا ایڈمنسٹر کیوں نہ ہو"

"یونہی سمجھ لیجئے ۔ آج سے مَیں گھر میں مارشل لا نافذ کر رہی ہوں ۔ لہٰذا اب اس کے ریگولیشن بھی سُن لیجئے ۔ نمبر ۱ چائے ، پان ، سگار بند ۔ نمبر ۲ ناغہ کے دن مرغی ، مچھلی کی بجائے سبزی پکے گی ۔ نمبر ۳ بس ، ٹرام اور رکشہ کی بجائے پیدل چل کر دفتر جانا ہو گا"

" کیا فرمایا ۔ پیدل چل کر دفتر جاؤں ؟ سبحان اللہ ۔ سبحان اللہ !"

"کیوں نہیں ، صاحب ۔ پیدل چل کر جانے سے آپ کے پاؤں دُکھ تو نہ جائیں گے ؟ بلکہ پیدل چلنے سے صحت اچھی رہے گی ۔ آج کل کی اس ہوش ربا گرانی میں کفایت شعاری کو اپنائیں گے نہیں تو اور کیا کریں گے ۔"

" اچھا تو یوں کہو نا کہ کفایت شعاری کی آڑ میں تم مجھ سے ورزش کروانا چاہتی ہو"

" ہاں صاحب گھر جو بنا کر بیٹھے ہیں تو سب کچھ کرنا پڑے گا ۔ اور یہ "سب کچھ" مَیں آپ ہی کے مفاد کی خاطر کہہ رہی ہوں ..... اور یہ بھی ایک ترکیب کہ جب کبھی شربت یا لسّی کی ضرورت محسوس ہو تو منہ میں شکر کی چٹکی ڈال کر اوپر سے برف کا ٹکڑا چوس لیں ۔ بچت کی بچت اور فائدہ کا فائدہ"

" شکریہ بیگم صاحبہ ! لیکن تم میرے ہی فائدے کی باتیں کرو گی یا اپنے مفاد کی بھی کچھ سوچو گی ؟"

" غور کیجئے ڈیئر ۔ آپ کو جو نفع ہو گا اس میں میرا بھی حصہ ہے نا ۔ آپ جو بچت کریں گے وہ گھر ہی میں تو استعمال ہو گی ۔ کئی بار ایسا بھی ہوا ہے کہ مَیں نے نئی ساری کے بغیر لوگوں کے یہاں شادی بیاہ میں شرکت کی ہے ۔ گو اس وقت اس قدر شرم و ندامت محسوس ہوئی ہے لیکن مجبوری کے تحت یہ بھی گوارا کر لیا گیا ۔ کئی ماہ ہو جاتے ہیں کوئی نئی پکچر دیکھنے کو نہیں ملتی ـــ پر صبر !"

" اچھا تو اب سمجھ میں آیا ۔ تم مجھ سے بچت کروا کر اپنے لیئے اچھی ساری خریدو گی ۔ اور نئی پکچر کے لیئے ٹکٹ بھی منگواؤ گی ۔ محترمہ کیا تم مجھے بیوقوف سمجھ رہی ہو ؟ میں بچت کروں ۔ اور آپ اس سے اپنا شوق پورا کریں ؟ اس کی مثال تو یہ ہوئی کہ ہوشیار لڑکی خود تو سسرال جاتی نہیں لیکن "بگلی" کو جانے کے لیئے تاکید کر رہی ہے"

" ہاں ہاں ۔ جانتی ہوں ۔ آپ کا اشارہ کس کی طرف ہے ؟ وہ ـــ بی ہمسائی کی لڑکی "صفیہ" جب سے سسرال سے روٹھ کر میکے آ بیٹھی آپ کو اس کے نام کی جلن ہے ۔ مَیں پوچھتی ہوں کہ کوئی اپنے سسرال جائے یا نہ جائے اس میں آپ کا کیا دخل ؟"

" دخل ... ؟ تمہاری عقل کی داد دے کر کہتا ہوں ... دخل آخر

کیوں نہ ہو۔ ہمسایہ کی ہر بات کا خیال رکھنا۔ یہ آجکل کے ہر ایک ہمدرد شہری کا فرض ہے۔"

"اوہ ہو۔ آپ بیچارے بڑے فرض ادا کرنے والے۔ بغیر سوچے سمجھے کسی کے ذاتی حالات میں دخل دینے کا نام فرض شناسی نہیں صاحب!"

"تو کیا میں بغیر سوچے سمجھے حق ہمسائیگی ادا کر رہا ہوں؟"

"اچھا اچھا۔ حق ہمسائیگی ادا کرتے سے پہلے "شوہرانہ حقوق" تو ادا کر دیتا کہ دن پھر میں۔ کب سے بحث کر رہی ہوں کہ جب تک مارشل لا ہے تب تک کچھ بچت کی طرف خیال کر لو ورنہ آگے جانتے ہو کوئی اور عوامی حکومت آجائے گی تو آٹے دال کا بھاؤ پوچھنے کی ہمت نہ ہوگی۔ یہ ایک سوال ہے۔"

"بیگم! معلوم ہوتا ہے ... تمہاری "اوپری منزل" بالکل خالی ہوگئی ہے عوامی حکومت آئے تو آٹے دال کا بھاؤ گھٹے یا بڑھے؟"

"چلو مان لیا کہ نرخ گھٹ جائیں گے مگر ساتھ ساتھ خریدار بھی تو بڑھتے جائیں گے نا؟ جوں جوں مال بکتا جائے گا بھاؤ گر کے بڑھتے جائیں گے۔ اور ہم اس کے ساتھ کھنچتے کھنچتے نہ جانے کونسی جگہ پر جا کر بیٹھ جائیں گے۔ اس لئے کہتی ہوں کہ بچت کئے بغیر چارہ نہیں۔"

"پر معاف کیجئے۔ بیگم۔ پیدل چل کر دفتر جاؤں۔ یہ تو کسی صورت ممکن نہیں۔"

"اجی صاحب! آپ ایک دو دن پیدل جا کر دیکھئے تو سہی۔ پھر تو ایسی مشق ہو جائے گی کہ آپ بس اور ٹرام سے بھی آگے نکل جائیں گے۔"

"بیگم خدارا ایسا مشورہ تو نہ دیجئے کہ میرا حوصلۂ ملازمت ہی ختم ہو جائے اور میں تھکن سے چور ہو کر دو وقت کی روٹی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھوں۔"

"لیجئے صاحب! آپ نے تو میری بچت اور کفایت شعاری کی ساری تجویز پر پانی پھیر دیا!"

"پھر جانے دو پانی۔ اگر بچت کی تجویز کی بجائے آمدنی کا ذریعہ برقرار رہتا ہو تو ۔۔"

"جی۔ آمدنی کے تو کئی ذرائع ہیں لیکن آپ میں اس کی قابلیت اور صلاحیت ہی کہاں ہے؟ دیکھئے وہ سامنے والی بی رقیہ کے میاں! دو گھنٹے بازار میں جاتے ہیں اور جیب بھر کر لاتے ہیں۔"

"بہت خوب۔ ان صاحب نے شاید روپیہ کا درخت لگا رکھا ہوگا جس پر سے توڑ کر لاتے ہیں۔ خدانخواستہ میں اگر ان کے نقش قدم پر چلوں تو دوسرے دن جیل کی ہوا کھانے لگوں۔"

"لو سنو ارشاد۔ "جیل کی ہوا کھانے لگوں۔" ناچنے کا ڈھنگ نہیں اور فرماتے ہیں آنگن ٹیڑھا۔ ان صاحب کو آج تک کیوں کسی نے جیل کا راستہ نہیں دکھایا؟"

"ان کا بھی کبھی وقت آ جائے گا۔"

"وقت آجائے گا تب نا۔ ابھی تو مزے سے گھر بھر رہے ہیں۔ کل ان کی بیوی آئی تھی میں تو اس کی ساری کا ڈیزائن، بلاؤز کا کپڑا اور سینڈل کی خوبصورتی دیکھ کر دنگ رہ گئی۔"

"اور وہ تمہاری "حریص" نگاہیں دیکھ کر "دنگ" رہ گئی ہوگی؟"

"آپ اس طرح بیچ میں بول کر بات کو نہ توڑیں۔ وہ بے چاری بڑی مخلص ہے مجھے مخاطب کر کے کہنے لگی کہ "آپ اگر ایسی ساری پہنیں تو قسم سے آپ کے جسم پر اس قدر زیب دے گی کہ آپ کے "وہ" تعریف کئے بغیر نہ رہ سکیں گے۔"

""وہ" کون؟"

"آپ۔ دوسرا کون؟"

"لیکن ڈیئر۔ میں تو تمہیں سادہ ساری میں دیکھ کر بھی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

"بہت اچھا۔ بات کو سطح سے نیچے گرانے کی کوشش نہ کرو۔ اور سنو۔ اس محبت شعار بہن نے مجھے ایسی ہی ایک ساری لا کر دینے کا وعدہ کیا ہے؟"

"صرف وعدہ ہی کیا ہے۔ یا اس پر عمل بھی ہوگا؟"

"جانیئے۔ میں آپ سے نہیں بولتی۔ ساری کوئی مفت میں تھوڑی آجائے گی ۔ ۔ ۔ ؟ اکہتر روپے اکیاون پیسے ہیں اس کی قیمت۔ آپ نے الماری کے چور خانے میں جو پیسے رکھے تھے اس میں سے میں نے اتنی رقم اسے دے دی ہے۔"

"کیا کہا؟ ... دے دی؟"

"ہاں ابھی ابھی دی۔ اور اس نے اسی وقت بازار سے ساری بھی لا دی۔"

"اچھا۔ تو تم نے اسے پیسے دیئے اور اس نے تمہیں ساری لا دی؟"

"جی ہاں۔ یہ رہی ساری ہیں۔ دکھاؤں؟"

"رہنے دو۔ گنوار۔ بے وقوف کہیں کی۔ ابھی تو مجھے بچت کرنے کے لئے کہہ رہی تھیں"

"یہ تو میں اب بھی کہہ رہی ہوں کہ آپ کفایت شعار بنیں گے تب ہی کچھ بچت ہوگی"

"اور اس بچت کو تم اپنے بے جا شوق کی نذر کر کے کسی دن مجھے بھی ختم کر دو گی۔ کان کھول کر سن لو۔ اب میں کسی چیز میں بھی کفایت شعاری نہیں برتوں گا"

"اچھا۔ یہ بات ہے؟"

جی ہاں۔ بالکل صحیح بات"

"اگر آپ اس صداقت پر قائم ہیں تو بس سمجھ لیں میں چلی اپنے میکے"

"تم میکے جاؤ۔ یا مارشل لاء دفتر۔ جی چاہے جہاں جاؤ مگر خدارا ایک بار یہاں سے دفع ہو جاؤ"

"اچھا تو صاف صاف کہہ دو نا۔ آپ نے مجھے گھر سے باہر کرنا ہے؟ میں گھر سے نکلوں۔ اور آپ عیش منائیں؟ نہیں صاحب۔ اس طرح آسانی سے میں آپ کا پیچھا چھوڑنے والی نہیں سمجھے؟"

"جی نہیں۔ خاک بھی نہیں!"

"تو اب سمجھ لو۔ کہ میں اس گھر کی مالکہ ہوں۔ مجھے اس گھر سے نکالنے والا کون ہے؟ لو بیٹھی۔ یا اللہ۔ مرد کی ذات بھی کس قدر بے مروت ہوتی ہے ....؟ تو مجھے کہتے ہیں میکے جا...!"

"بیگم صاحبہ۔ میں نے کب کہا؟ تم خود ہی جانے کو تیار ہو گئیں اور پھر کچھ سوچتے ہوئے.... خود ہی اس ارادے سے باز نہیں؟"

"ہٹو دور ہٹو۔ آپ ہیں تو آخر نا بچے ایک ساری خریدنے پر اس قدر طوفان مچا دیا۔"

"ایک کیا اگر تم چاہو تو ابھی دو ساریاں خرید لو۔ لیکن ڈیئر! مجھے کفایت شعاری کا سبق بھی نہ پڑھائیں۔ خیر چلو جو کچھ بھی ہو آئندہ سے خیال رکھیئے ورنہ خفا ہو کر دیکھئے۔ اور ذرا مجھے وہ ساری پہن کر تو دکھایئے

(باقی ص۵۶ پر)

ازدواجی کہانی

ذوالفقار جہاں

دُوسرا ہنی مون

اُن کا خط پڑھ چکنے کے بعد میرا دل یہی چاہا کہ لکھ بھیجوں "اگر تم آئندہ کبھی نہ آؤ تو بھی مجھے کوئی پروا نہ ہوگی"

انھوں نے لکھا تھا "میں تو یہی چاہتا تھا کہ گھر پہنچوں مگر کچھ بے حد ضروری کام آپڑے ہیں۔ اگر کوشش بھی کروں تو ہفتے کو سہ پہر سے پہلے گھر نہ پہنچ سکوں گا۔ اور اتوار کی صبح کو پھر وہاں سے روانہ ہونا پڑ جائے گا۔ اگر نہ گیا تو وہ کام پورے نہ ہو سکیں گے جو اس وقت زیرِ تکمیل ہیں"۔ میں نے ان کا خط ہاتھ میں اٹھایا اور توڑ مروڑ کر پرے پھینک دیا۔ غصے کے مارے میرا بُرا حال ہو رہا تھا۔

"تم کو نہ اپنے گھر کی پروا ہے نہ میری!" میں نے اس طرح کہا جیسے وہ اس وقت میرے سامنے موجود ہیں۔ اور میں ان کو پھٹکار رہی ہوں۔ "کیا ضرورت تھی پچھلی ملازمت چھوڑ کر یہ ملازمت کرنے کی۔ جس میں لگاتار اتنے طول طویل دورے کرنے پڑ رہے ہیں؟"

یہ ڈانٹ پلانے کے دوران میں، میرا تصور میرے شوہر کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے لے آیا تھا۔ ہونٹوں پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ، اسی طرح تازگی بخش، جس طرح جاڑے کے دنوں میں صبح کی دھوپ ہوا کرتی ہے آنکھوں میں یہ خاموش التجا کہ میں ان کی بات کا مطلب سمجھوں، اور وہی چمک جو میرے چہرے پر نظر دوڑاتے وقت اُن میں اچانک پیدا ہو جاتی تھی۔

مجھ کو ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی ان آنکھوں کے اس طرح دیکھنے سے حیا آنے لگی۔ ادھر ان کے خط پر غصہ۔ ادھر یہ حیا۔ کھسیانی سی ہو کر رہ گئی۔

میں نے، رُو کھتے مگر نہ رو سکنے کے انداز سے، ان کے تصور سے کہا "پچھلی ملازمت کے دنوں میں تم روز تیسرے پہر کے وقت گھر آجایا کرتے تھے۔ کیسی دلکش چہل پہل ہوا کرتی تھی، سرِ شام!! اور رات کو سونے کے وقت تک شب برات کا سا سماں رہتا تھا، ہمارے گھر میں۔ مگر اب، اب۔ مزید برداشت نہ کر سکنے کی وجہ سے میں رو دی اور اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر سسکیاں لینے لگی۔

اگر وہ موجود ہوتے تو فوراً اٹھ کر، "ہیں ہیں۔ یہ کیا ہوا؟" کہتے ہوئے میرے ہاتھ میرے چہرے سے الگ کرتے۔ اور سر کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے مجھے سمجھا بجھا کر منا لیتے مگر وہ گھر پر تھے کہاں وہ تو اس وقت گھر سے میلوں دُور تھے۔

میں نے تصور کی آنکھ سے دیکھا۔ وہ مجھے مناتے جاتے ہیں اور کہتے جاتے ہیں "عاشی۔ خدا کے لئے میری بات سمجھو، میری"

"بس بس۔ مجھے پیاری نہ کہنا۔ دیکھ لیا تمہارا پیار۔ سب زبانی باتیں ہیں"

"نہیں نہیں"۔ وہ کہہ رہے ہیں "زبانی باتیں نہیں ہیں اگر یہ ملازمت مستقل ہو گئی تو مالی طور پر ہمارے حالات بہتر ہو جائیں گے"

"مگر۔" میں نے تصوراتی مدہوشی دور کرتے ہوئے خود سے کہا۔ "وہ یہاں ہیں کہاں احمق عورت!"

اپنی اس بیوقوفی پر میں کھلکھلا کر ہنس دی۔ اس سے غصے کی کیفیت کافور ہو گئی۔ میں نے خود سے کہا "ملازمت کی مجبوری ہے۔ وہ بھی آخر کیا کریں"

مگر غصہ دور ہو جانے کے بعد بھی مجھ پر جھنجھلاہٹ طاری تھی۔

اسے دور کرنے کے لئے میں نے ایک انگریزی میگزین اٹھا لیا۔ اور اس کی رنگین تصویریں دیکھ کر اپنا غم غلط کرنے لگی۔

اچانک میگزین کے ایک صفحے پر ایک مرد کی تصویر نظر سے گزری وہ ہو بہو انہی جیسا تھا۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں ویسی ہی سنسنی سی دوڑ گئی جیسی اس وقت دوڑی تھی جب میں نے اپنے شوہر کو اپنی ایک سہیلی کے ہاں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔

حمیدہ، جسے پیار سے سب حمیدی کہتے تھے۔ میری نہایت عزیز سہیلی تھی۔ جب کبھی ہمارے گھر آجاتی تھی۔ گھنٹوں تک اپنے گھر جانے کا نام نہ لیتی تھی۔ اسی طرح میں اس کے گھر چلی جاتی تھی تو ایسا محسوس کرتی تھی۔ جیسے اپنے ہی گھر میں ہوں۔ ہم دونوں کے خاندانوں میں بھی بڑا گہرا میل جول تھا۔ یہاں تک کہ پردہ بھی نہ کیا جاتا تھا۔ بلکہ حمیدی کے رشتے کے بھائی تک میرے گھر میں اور میرے رشتے داروں کے لڑکے بالے اس کے گھر میں صرف آواز دے کر بے تکلفی سے داخل ہو جایا کرتے تھے۔ ایک دن جب میں حمیدی کے ہاں گئی ہوئی تھی ایک نیا چہرہ نظر آیا

"یہ کون بزرگ ہیں؟" میری نظریں اس بلیے سے دلکش نوجوان پر تھیں جو اپنا بھولا بھولا، اجلا اجلا سا چہرہ لئے ہوئے قدم جما جما کر رکھتا اندر آیا تھا۔ حمیدی کی نظریں کیرم بورڈ پر جمی ہوئی تھیں۔ میں جلدی جلدی سٹرائیکر گھما گھما کر اپنی گوٹیاں سے خانے بھر رہی تھی جس سے حمیدی بدحواس ہو کر رہ گئی تھی۔

"ہوں!" اس نے کیرم بورڈ کو گھورتے ہوئے کہا۔ "کون بزرگ آگئے؟"

"ٹال رہی ہے" میں نے بہت چپکے سے لفظی چٹکی لی۔ "شاید یہ حضرت تیرے ہونے والے "وہ" ہیں!"

"کیا؟" اس نے تنک کر کہا۔ اور پھر سر اٹھا کر صحن کی طرف دیکھا۔ جس میں آنے والا نوجوان تلے تلے قدم اس طرح اٹھا رہا تھا جیسے دروازے سے کمرے کی دہلیز تک کا فاصلہ ماپ رہا ہے۔ "اے یہ!"

"ہاں یہ!" میں نے اسی کی طرح الفاظ کو کھینچا۔

"یہ" حمیدی نے کہا۔ "حیدر آباد والی خالہ کے بڑے لڑکے ہیں۔ نئے نئے وارد ہوئے ہیں"۔

"چلتے خوب ہیں" میں بولی "شاید گن گن کر قدم رکھتے ہیں"

"اس کا صرف چلنا ہی ایسا نہیں ہے" حمیدی کہنے لگی۔ "پوری زندگی اسی طرح تلی تلی ہے۔ انتہائی باضابطہ اور منظم۔ ہر کام میں مستقل مزاج ہے۔ بولتا بھی بہت کم ہے۔ مگر جب کبھی بولتا ہے۔ بروقت بولتا ہے اور جچی تلی بات کہتا ہے۔ اور اس کے بعد پھر خاموش ہو جاتا ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہے" میں نے کہا "کہ بڑا ٹھوس اور سنجیدہ قسم کا انسان ہے۔ نام کیا ہے ان قبلہ و کعبہ کا؟"

"مستقیم" حمیدہ نے بتایا "مستقیم علی خاں" اور الفاظ ادا کرتے میں اس طرح آنکھیں گول کر کے گردن ہلاتی رہی۔ جیسے جتا رہی ہے کہ کتنا شاندار اور عظیم الشان نام ہے"۔

میں نے کہا "نام بھی ویسا ہی ٹھوس اور سنجیدہ ہے جیسی حضرت کی زندگی ہے"۔

"پسند آگئے؟" حمیدہ نے اچانک حملہ کیا "مبارک ہو!"

"کیا؟" میں نے تیوریاں چڑھائیں "یہ کیا بک رہی ہے؟"

"اجی" حمیدہ نے دیدے مٹکائے "دائی سے پیٹ چھپانا۔ اور سہیلیوں سے محبت چھپانا ممکن نہیں ہوا کرتا ملکہ نورجہاں صاحبہ!"

"تو تو سدا کی زبان دراز ہے" میں نے گھبرا کر کہا "تجھ سے باتوں میں بھلا کون جیت سکتا ہے"۔

"نہیں ذولی" حمیدی اچانک سنجیدہ ہو گئی "لڑکا بہت اچھا ہے اگر تجھے پسند آگیا ہو تو میں امی سے ذکر کردوں۔ وہ خالہ سے بات چھیڑ دیں گی"

میں نے شرما کر منہ پھیر لیا۔ حمیدہ کہنے لگی "میں سمجھ گئی۔ مگر ایک بات اور بھی بتا دوں۔ مستقیم سنجیدہ قسم کا لڑکا ہے جو اپنے کام اور فرائض کو اور سب چیزوں پر ترجیح دیتا ہے"۔

میں نے کہا "پھر کیا ہوا؟"

وہ بولی "یہ بات میں نے اس لئے بتا دی کہ آجکل کی لڑکیاں ٹھوس قسم کے لڑکے سے کنی کاٹتی ہیں"۔

مگر مجھے مرد کی یہی صفت دل سے پسند تھی۔ البتہ شادی ہونے سے پہلے یہ اندیشہ ضرور تھا کہ ٹھوس طبیعت، سنجیدہ مزاج، باضابطہ منظم، جچی تلی بات کہنے والے اور گن گن کر قدم رکھنے والے مستقیم علیخاں کہیں نرے خشک ہی نہ نکلیں۔ مگر شادی کے بعد ان کی مزید اداؤں اور

جھنسانے والی حرکتوں سے اس اندیشے کی تردید ہو گئی۔

ایک دن کہنے لگے "حمیدہ نے مجھے اسی روز بتا دیا تھا جس روز تم نے مجھے اپنے دل کی مملکت کا پاسپورٹ عنایت کیا تھا۔"

"بڑی چغلخور ہے مردار کہیں کی" میں تلملا کر بولی

ہنس کر کہنے لگے "وہ چغلخور ہو یا نہ ہو مگر جو بات میں کہنی چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ تم نے دیکھا ہوگا اس کے بعد بھی میں نے تمہاری اس مملکت پر آنکھوں، حرکتوں، باتوں یا تحفوں کے ذریعہ کوئی حملہ نہیں کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ . . ."

"اپنی سنجیدگی اور ٹھوس پن کو چھوڑنا نہ چاہا" میں نے کسی قدر ترشی سے کہا۔

کہنے لگے "نہیں نہیں۔ ان بے چاروں کو چھوڑنے یا نہ چھوڑنے کا معاملہ نہیں تھا۔ کیونکہ تم کو دیکھنے کے بعد تو ٹھوس پن یا سنجیدگی کو بھولنا کچا بندہ اپنے ہی کو بھولنے لگا تھا۔ بات اصل میں یہ تھی کہ حمیدہ سے سن لیا تھا تم کو میری سنجیدگی پسند ہے اس لئے میں اپنے اوپر جبر کر کے سنجیدہ بنا رہا۔"

میں حیرت سے ان کا منہ تکنے لگی۔ وہ کہتے رہے "بلکہ ایک مرتبہ تو میں نے یہ ارادہ بھی کیا تھا کچھ عرصے کیلئے اس شہر سے چلا جاؤں گا"

"وہ کیوں؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"وہ یوں" آپ بولے "کہ ذرا تمہیں اپنے فراق میں تڑپاؤں کیونکہ یہ تو مجھے یقین ہو ہی چکا تھا کہ تم مجھ پر فریفتہ ہو گئی ہو"

"اوں!" میری تیوری پر بل مگر ہونٹوں پر ہنسی تھی "بڑے آئے تھے فراق میں تڑپانے والے۔ میں زہر کھا لیتی"

کہنے لگے "اسی ڈر سے تو نہیں کہ جو لڑکی ایک ٹھوس اور سنجیدہ لڑکے کو اپنا شوہر بنانا پسند کرتی ہے وہ خود بھی ارادے کی بڑی پکی اور ٹھوس قسم کی مخلوق ہوگی"

شادی کے بعد ہماری زندگی بڑی پُربہار رہی اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ میری نظروں میں میرا شوہر بڑا شاندار انسان تھا کیونکہ وہ محبت بھرے دل اور نرم رویے کے باوجود ضابطے کا بڑا پابند تھا

بہت جلد ہم نے اپنا ذاتی مکان بھی بنا لیا۔ پھر اس نئے مکان کے لئے سامان خریدنے کی مہم شروع ہوئی میں دن رات اس میں منہمک رہتی مگر جب شام کو مستقیم گھر آتے تو ہم دونوں ایک دوسرے میں گم ہو کر اور سب کچھ فراموش کر دیتے۔

ایک دن وہ گھر آئے تو چہرہ خوشی سے جگمگا رہا تھا کہنے لگے "آج سے تم ایک کمپنی کے مینیجر کی بیگم صاحبہ ہو" میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ انہوں نے بتایا کہ کس طرح انہوں نے پچھلی ملازمت چھوڑ دی ہے اور اس نئی ملازمت میں تنخواہ دگنی ہوگی۔ مگر جب انہوں نے یہ بتایا کہ اب ان کا کام یہ ہوگا کہ پورے ملک کے دورے کرتے پھریں تو میرا دل بجھ سا گیا۔ وہ معقول قسم کی نئی ملازمت ملنے کی خوشی میں میری مایوسی کی طرف توجہ نہ کر سکے۔ اور کھانا کھانے کے بعد بہت جلد سو گئے مگر میں جاگتی رہی اور سوچتی رہی۔ کہ آئندہ میں رات دن اکیلی کس طرح رہ سکوں گی۔ ہم دونوں نے خود کو ایک دوسرے سے اس طرح باندھ لیا تھا کہ مجھے ان کی صورت دیکھے بغیر چین نہ آتا تھا۔ سوال یہ تھا کہ اب وہ کئی کئی دن تک نظر نہ آئیں گے تو مجھ پر کیا گزرے گی،

اگلے دن صبح کو ناشتے کے دوران میں نے ان سے کہا۔

"دیکھئے۔ آپ یہ نئی ملازمت نہ کیجئے۔"

"کیوں؟؟" ان کا منہ حیرت کی شدت سے کھلا کا کھلا رہ گیا

"ہاں" میں نے کہا "میں نہیں چاہتی کہ آپ یہ ملازمت کریں"

"عجیب محترمہ ہو تم بھی" انہوں نے اپنا دایاں ہاتھ بڑھا کر میرا گال تھپتھپایا "لوگ تو ایسے سنہری موقعے ڈھونڈتے پھرتے ہیں اور ان کی بیویاں انہیں ہر وقت تلقین کرتی رہتی ہیں کہ زیادہ تنخواہ کی ملازمت ڈھونڈو مگر تم چاہتی ہو کہ میں ایک زریں موقع ہاتھ لگ جانے کے بعد بھی گنوا دوں۔ آخر تم کیوں چاہتی ہو کہ میں یہ ملازمت نہ کروں؟؟"

میں نے کہا "تمہارے ہاتھ تو سنہری موقع لگ رہا ہے مگر میری زندگی تمہارے بغیر ویران ہو کر رہ جائے گی"

"میں کوئی مر تو نہیں رہا" وہ بولے "پھر تمہاری زندگی ویران کیوں ہونے لگی؟"

میں نے کہا "ویران نہیں ہوگی تو کیا تمہارے ہفتوں تک غائب

رہنے سے اس میں رونق آجایا کرے گی؟"

کہنے لگے "اچھا یہ بات ہے!"

"جی ہاں" میں ان کے لہجے کی نقل اتارتے ہوئے بولی۔ یہ بات سن کر کہنے لگے "تم بھی ساتھ چلی چلا کرو"

میں جھٹ بولی "ہاں میں تیار ہوں۔ لے چلا کرو۔ اگر ایسا ہونے لگے تو جو کچھ اب تک کہا ہے اس کا ایک ایک لفظ واپس"

انہوں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "ہر دورے میں تو ساتھ نہیں ہو سکے گا۔ البتہ کبھی کبھی ضرور ساتھ لے لیا کروں گا۔ مگر تمہاری شکایت پھر بھی باقی رہے گی۔ کیونکہ ۔ ۔ ۔ میں تو تم کو کسی ہوٹل میں چھوڑ کر کمپنی کی مقامی شاخوں کے معائنے کے لیے نکل جایا کروں گا۔ اور تم ہوٹل کے کمروں میں اکیلی ہی پڑی رہا کرو گی ۔ ۔ ۔ ۔ اس کے علاوہ کمپنی تمہارا سفر خرچ بھی نہیں دے گی۔ اس طرح دورہ بہت مہنگا پڑ جایا کرے گا"

"گویا مجھے یہیں رہنا ہو گا" میں نے پوچھا "یہی مطلب ہے نا آپ کا؟"

بولے "ہاں اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں"

"گویا آپ یہ ملازمت نہیں چھوڑ سکتے؟" میں نے پوچھا

کہنے لگے "تنخواہ معقول ہے۔ دورے کا الاؤنس الگ ملے گا"

"گویا" میں نے جل کر کہا "آپ کے لئے یہ ملازمت مجھ سے بڑھ کر ہے"

انہوں نے اداس نظروں سے میری طرف دیکھا "تم جانتی ہو کہ میرے لئے دنیا میں تم سے زیادہ عزیز کوئی چیز نہیں۔ لیکن تم یہ بھی جانتی ہو گی کہ مجھے اپنے فرض کا بھی بڑا خیال رہتا ہے۔ اور ترقی کرنا انسان پر فرض ہے"

"اچھا جی" میں نے بات ختم کرتے ہوئے کہا "آپ ترقی کرتے رہیے"

کہنے لگے "اس وقت مجھے مزید گفتگو کی فرصت نہیں ہے ورنہ تم کو قائل کر کے چھوڑتا۔ دیر ہو جائے گی تو جس کام کیلئے جانا ہے وہ ادھورا رہ جائے گا۔ اس لئے پھر کسی وقت تفصیل سے بات کریں گے"

"ہر وقت کام کام کام" کہتی ہوئی میں کمرے سے باہر نکل آئی اور خوابگاہ میں پہنچ کر چادر تان کر لیٹ رہی۔ میرا خیال تھا کہ وہ جاتے وقت مجھ سے مل کر جائیں گے۔ مگر وہ ملے بغیر ہی چلے گئے۔ مجھے جب یہ معلوم ہوا تو دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر خوب روئی۔

جمعے کے روز دوپہر کے وقت ان کا فون آیا کہنے لگے۔ "ذوالفقار جہاں بیگم صاحبہ عرف ذولی۔ پانچ سو میل پرے سے سلام عرض کرتا ہوں!"

میں دل میں خوشی کی گدگدی محسوس کر رہی تھی۔ ان کی آواز ہی سے میری روح جھوم اٹھی۔ مگر بناوٹی غصہ دکھانے کے لئے ذرا تلخ لہجے میں جواب دیا "وعلیکم السلام۔ بارے آپ کے مینیجر بننے کا ایک فائدہ تو ہوا ہے"

پوچھنے لگے "وہ کیا؟"

میں نے طنزاً ہنس کر کہا "وہ یہ کہ گھر میں فون لگ گیا ہے تاکہ آپ مجھ سے پانچ سو میل دور رہ کر علیک سلیک کر سکیں!"

بولے "بیگم صاحبہ۔ ایسی کڑوی باتیں نہیں کیا کرتے۔ تم کو خوش ہونا چاہیئے کہ اب تم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اچھا ہاں۔ میرا خط مل گیا نا؟ آج صبح ملا ہو گا"

"جی ہاں" میں نے اپنے لہجے میں کوئی تبدیلی نہیں کی "مل گیا ہے میں جواب میں جو کچھ لکھتی وہ زبانی عرض خدمت کر دیتی ہوں۔ اور وہ یہ ہے کہ اگر آپ آئندہ کبھی گھر نہ آئیں تو بھی مجھے کوئی پرواہ نہ ہو گی"

اور آخری لفظ زبان سے نکلنے کے فوراً بعد میں نے فون کا ریسیور کریڈل پر دے مارا۔ اتنے زور سے کہ میری ایک انگلی درمیان میں ہونے کی وجہ سے زخمی ہو گئی۔

اس وقت میری آنکھوں میں بے کسی کے آنسو امڈے چلے آ رہے تھے اور یہی جی چاہ رہا تھا کہ سر دیوار پر دے ماروں۔

فون کی گھنٹی ایک بار پھر بجنے لگی۔ میرا دل روتے روتے بھی بڑے زور سے دھڑکا۔ شاید وہ یہ کہنا چاہتے ہوں کہ گھر آ رہے ہیں!

میں نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔ انہوں نے ادھر سے کہا۔

"ذولی۔ میری بات سنو۔ ذرا ٹھنڈے دل سے۔ جیسا کہ میں نے خط میں بھی لکھا ہے۔ میرا دل یہی چاہ رہا ہے۔ کہ پر لگا کر اڑوں اور گھر پہنچ کر ہی دم لوں مگر بعض بے حد ضروری فرائض کی وجہ سے مجبور ہو گیا ہوں۔ میں ہفتے کے دن تیسرے پہر تک ضرور پہنچ جاؤں گا"

"کیا ضرورت ہے ہفتے کے روز بھی آنے کی" میں نے جل بھن کر کہا "ابھی تو ہفتے میں سات دن ہیں۔ ان دنوں میں کچھ اور بے حد ضروری فرائض ٹپک پڑیں گے۔ اور ان کی وجہ سے آپ پھر گھر نہ آ سکنے پر مجبور ہو جائیں گے"

انہوں نے ادھر سے پھر کچھ کہنا شروع کیا۔ مگر میں نے "بس کیجئے" کہتے ہوئے کھٹ سے فون بند کر دیا۔

سب سے پہلے دورے کے بعد جو سات دن کا تھا وہ گھر آئے تھے۔ تو بہت جلدی میں تھے۔ تمام وقت اگلے دورے کی باتیں کرتے رہے اور اگلے دن صبح ہی جلدی جلدی سامان باندھنے کے بعد آدھا پونا ناشتہ کر کے چلے گئے۔ اس کے بعد پھر پندرہ دن تک دورے پر رہے تھے۔ اس دوران میں انہوں نے دو تین مرتبہ فون ضرور کیا تھا مگر اتنے سے میری پیاس کہاں بجھ سکتی تھی۔ انہوں نے جب بھی فون کیا ان کی آواز سن کر میرا احساسِ تنہائی اور زیادہ سنگین ہو گیا۔

اس کے بعد کے مہینوں میں ان کے دوروں کی مدتیں اور لمبی ہوتی گئی تھیں۔ ایک مرتبہ ایسا بھی ہوا تھا۔ کہ انہوں نے فون پر اطلاع دی تھی پرسوں گھر پہنچ رہا ہوں۔ (یہ ایک طرح کا وعدہ تھا جس سے میری اُجاڑ زندگی میں بہار سی آ گئی تھی) مگر وہ اس دن گھر نہ پہنچے تھے۔ اس کے بعد دوبارہ یہی ہوا تھا۔

میں ان حالات سے اکتا ہی نہیں گئی تھی۔ بیزار بھی ہو گئی تھی۔ اسی لئے میں نے جل کر فون پر انہیں کہا تھا۔ کہ تم اب کبھی گھر نہ آؤ تو بھی مجھے کوئی پروا نہیں۔

مگر جب ایک بار پھر فون کی گھنٹی بجی تو میں اپنا سارا غصہ اور تمام بیزاری بھول گئی۔ اور ریسیور کے قریب منہ لے جا کر اسی پیار سے، جو میرے دل سے ان کے لئے ہر وقت آبشار کی طرح چھلکتا رہتا تھا۔ بہت آہستہ سے کہا "جی!"

دوسری طرف حمیدہ بڑے زور سے ہنسی۔ پھر اس نے میرے لہجہ کی نقل اتارتے ہوئے کہا۔ "جی۔" اس کے بعد اپنے لہجے میں بولی "مینیجرنی صاحبہ۔ میں ہوں حمیدہ بیگم صاحبہ۔ آپ کے مینیجر صاحب جناب مستقیم علی خاں نہیں ہیں"

وہ ہنستے ہنستے رکی۔ پھر پہلے کی طرح میرے لہجے کی نقل اتارتے ہوئے بولی "جی!"

میں نے جھلا کر کہا "تو مار تو نہیں کھائے گی؟"

"اچھا" وہ چلائی "وہ غصہ مجھ پر اتار رہی ہے جو اپنے مینیجر پر اتارنا چاہیئے تھا۔ دوروں پر دورے کرتا رہتا ہے وہ۔ تجھ بے چاری کو فراقِ یار کی تنہائی میں تڑپاتا ہے وہ اور غصہ مجھ غریب پر! بھئی واہ!"

میں نے کہا "تجھ پر خدا کی کونسی مار پڑی ہے جو تو نے اس وقت فون کیا ہے؟ بول۔ پھوٹ اپنے پھٹے منہ سے۔"

وہ کہنے لگی "پہلے تو یہ بتا کہ اتنی جھلائی ہوئی کیوں ہے؟"

میں بولی "جھلاؤں نہیں تو کیا قہقہے لگاؤں۔ فرائض کا خیال رکھنے والے مستقیم علی خاں ایک ہفتے سے غائب تھے اور ابھی ابھی فون پر حضرتِ محترم نے یہ جانفزا خوشخبری دی ہے کہ اب بھی گھر نہیں آ رہے مجھ کرموں جلی کو صرف سات دن اور ان عالی مقام کے انتظار میں سو کھنا پڑے گا۔ سن لیا تو نے؟ ہو گیا ہو گا اب تو تیرا کلیجہ ٹھنڈا؟"

"اُفوہ۔ پارہ بہت زیادہ چڑھا ہوا ہے" حمیدہ نے ادھر سے کہا "چل اب غصے کو تھوک دے۔ آج ہمارے ہاں ایک فنکشن سی ہے رات کو۔ آ جائیو! اچھے اچھے کھانے بھی تجھے زہر مار کرا دوں گی اور ہنسنے بولنے سے تیری وہ کوفت بھی دور ہو جائے گی جو تیرے مینیجر نے تیرے دل پہ لاد دی ہے۔ گدھا کہیں کا۔ اور تو ہے کہ اس پر مری جاتی ہے۔ وہ ہے کہ۔ ۔ ۔"

"بس کر چڑیل۔" میں چلائی "ورنہ رات کو تیری اس موئی فنکشن میں نہیں آؤں گی۔"

"اچھا اچھا" حمیدہ کا لہجہ صلح کن ہو گیا "رات تک کیلئے خدا حافظ!"

میرے اور حمیدہ کے خاندان میں پردہ تو ہوتا ہی نہیں تھا اس لئے میں شام کے سات بجے حمیدہ کے دروازے پر ٹیکسی سے اتری تو بے تکلفی سے اندر چلی گئی۔ مگر وہاں ابھی تک کوئی بھی نہیں آیا تھا۔ صرف ایک کوچ پر ایک مرد بیٹھا تھا۔ میں ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ لمبا قد، بڑا ہی حسین چہرہ، اور جادو بھری آنکھیں۔ اور اس نے یہ آنکھیں اٹھا کر میری طرف جس انداز سے دیکھا وہ بالکل مستقیم جیسا تھا۔

وہ میرے کمرے کے اندر داخل ہوتے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کمر تک جھکتے ہوئے بولا "آیئے ذوالفقار جہاں صاحبہ!"

مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ کہ یہ اجنبی مرد مجھے کیسے جانتا ہے وہ کہنے لگا "آپ حیران نہ ہوں۔ میں سلطان احمد ہوں۔ آپ مجھے پہچان نہیں رہی ہیں؟"

"اوہ!" میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا "آپ سے تو جیسے صدیوں کے بعد ملنا ہوا ہے۔ کہاں غائب ہو گئے تھے آپ؟"

سلطان حمیدہ کا چچا زاد بھائی تھا ایک مدت سے اپنے والد کا تبادلہ ہونے کی وجہ سے باہر تھا

سلطان کہنے لگا "آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔ ابا کا تبادلہ کراچی ہو گیا۔ میں وہاں سے بغرضِ تعلیم امریکہ چلا گیا۔ آپ مجھے بھول ہی گئیں۔ اتنا زیادہ کہ اب پہچانتی بھی نہیں"

میں نے کسی قدر جھینپ کر کہا "چلیئے اب تلافی کر دیتی ہوں" آجکل آپ ہیں کہاں؟ کیا کر رہے ہیں؟ شادی ہو گئی ہے یا ابھی تک تجرد کی زندگی بسر کر رہے ہیں"

وہ بڑے زور سے ہنسا "آپ نے تو یکلخت اتنے سارے سوال کر ڈالے"

اتنے میں حمیدہ کمرے کے اندر داخل ہوئی "آگئیں مینجرنی صاحبہ" اس نے کچھ اس انداز سے کہا۔ کہ میں اور سلطان دونوں اپنی باتیں چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہو گئے

"بھائی سلو" اس نے سلطان سے مخاطب ہو کر کہا "یہ ذولی بے چاری ایک کمپنی کی مینجری کی بھینٹ چڑھ گئی ہے!"

"بھینٹ؟" سلطان نے حیرت سے پہلے میری طرف اس کے بعد حمیدہ کی طرف دیکھا "بھینٹ کا مطلب تو جہاں تک مجھے معلوم ہے یہ ہوتا ہے کہ کسی انسان کو کسی دیوتا پر قربان کر دیا جائے"

"ہاں ہاں" حمیدہ ہنسی "یہی مطلب ہے میرا بھی"

"میں اب بھی نہیں سمجھا کہ تم کیا کہنا چاہ رہی ہو" سلطان نے حمیدہ سے کہا۔

"میں یہ کہنا چاہ رہی ہوں جناب امریکہ ریٹرنڈ" حمیدہ چہکی "کہ یہ خوبصورت سی جو صاحبہ آپ کے سامنے بیٹھی ہیں ان کی شادی خانہ آبادی ایک صاحب کے ساتھ ہوئی جن کا اسم گرامی ہے مستقیم علی خاں۔ بڑا ہی رعب دار نام؟ چنانچہ شاید اسی شاندار نام کی وجہ سے ان کو ایک کمپنی کی مینجری دی گئی ہے مگر یہ مینجری اس بے چاری عورت کے لئے ایک مصیبت بن گئی ہے کیوں بھئی ذولی بن گئی ہے نا؟" اچانک وہ میری طرف مڑ گئی۔

"یہ کیا گورکھ دھندا قسم کی بکواس ہے" سلطان نے بدحواس ہو کر کہا "تم چند لفظوں میں بات کیوں نہیں کہہ دیا کرتیں حمیدہ؟"

"لیجئے بھائی" حمیدہ بولی "قصہ مختصر یہ کہ مستقیم علی خاں بہادر دوروں پر رہتے ہیں اور یہ تنہائی میں پڑی سڑتی رہتی ہے۔۔۔ اچھا میں ذرا ابھی آئی" اور وہ کمرے کے باہر چلی گئی۔

"اوہ۔۔۔!" سلطان نے لفظ کو لمبا کھینچا "میں اب سمجھا" پھر مجھ سے کہنے لگا "اس کا علاج کونسا مشکل ہے۔ آپ اپنی تنہائی دور کرنے کیلئے دوست اور سہیلیاں پیدا کیجئے۔ اور ان کے ساتھ لطف سے وقت گزار لیجیے اس کام کیلئے آپ کو جو لوگ درکار ہوں گے ان میں سے ایک تو میں ہی ہو سکتا ہوں" اور اس نے میری طرف ایسی نظروں سے دیکھا کہ مجھے حیا آنے لگی جسے چھپانے کے لئے میں ناک صاف کرنے کا بہانہ کر کے باہر نکل آئی۔

جب میں برآمدے میں کھڑی یہ سوچ رہی تھی کہ اندر جاؤں یا نہ جاؤں اچانک مجھے مستقیم یاد آئے اور میری آنکھوں تلے فضا میں ان کا چہرہ تیرنے لگا۔ "مجھے اندر نہیں جانا چاہیئے" میں نے خود سے کہا "یہیں سے گھر واپس چلے جانا چاہیئے۔ اور وہاں سے فون پر حمیدہ کو اطلاع دے دینی چاہیئے کہ میری طبیعت اچانک بگڑنے لگی تھی۔ اس لئے چلی آئی"

مگر میں صحن کی طرف قدم بڑھا ہی رہی تھی کہ سلطان برآمدے میں نمودار ہو گیا "ارے۔ آپ کہاں چلیں" اس نے ایسے انداز سے کہا جو مجھے بڑا ہی دلکش معلوم ہوا۔

میں نے اپنی آواز کو نحیف بنا کر کہا "میری طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے اس لئے گھر جا رہی ہوں"

"تو آپ نے مجھ سے کہا ہوتا" وہ جلدی سے میرے قریب آگیا، اور اس نے اپنا دایاں ہاتھ بڑھا کر میرا ایک ہاتھ پکڑ لیا "میرے پاس کار ہے آیئے میں آپ کو کار میں بٹھا کر آپ کے گھر پہنچا دوں"

میں نے کہا "شکریہ! کار کی ضرورت نہیں۔ میرا مکان یہاں سے چند قدم ہی کے فاصلے پر ہے"

میں ہر ممکن بہانے سے اس سے دور ہونا چاہتی تھی کیونکہ مجھے محسوس ہو رہا تھا۔ کہ وہ میرے اور مستقیم کے درمیان آ کھڑا ہونے کی انتہائی کوشش کر رہا ہے۔ اور اس کی پیاسی نظریں اور میٹھی میٹھی باتیں میرے لئے ہلکا ہلکا جادو بنتی جا رہی ہیں۔

"اچھا تو چھوڑیئے کار کو" سلطان کی آواز میرے کانوں میں پڑی

"میں آپ کو پیدل ہی آپ کے گھر لیے چلتا ہوں۔" وہ میرا پیچھا چھوڑنے کو تیار نہ تھا۔

رات ٹھنڈی تھی۔ مگر جب میں باہر نکلی تو میں نے محسوس کیا کہ سلطان کے ساتھ ہونے کے احساس سے میرا چہرہ جل سا رہا ہے۔ راستے میں وہ مسلسل بولتا رہا۔ خبر نہیں اس نے کیا کیا کہہ ڈالا۔ مگر میں نے اس کی کوئی بات توجہ سے نہیں سنی۔ کیونکہ میری آنکھوں میں تمام وقت مستقیم کا چہرہ پھرتا رہا۔

جب میں اپنے گھر کے دروازے پر پہنچی تو میں نے کنجی جیب سے نکال کر قفل میں ڈالتے ہوئے کہا: "سلطان صاحب آپ کے تکلیف کرنے کا بہت بہت شکریہ!"

"کوئی بات نہیں۔" سلطان مجھ سے نظر ملانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا: "میں تو آپ کی ہر خدمت کے لئے تیار ہوں۔"

میں نے اس کی نظر ملانے کی کوشش کامیاب نہیں ہونے دی۔ اور دھیمی نرمی سے کہا: "آپ کا یہ جذبہ قابلِ تحسین ہے۔ مگر مجھے آپ سے کیا خدمت لینے کی ضرورت ہوگی؟"

اس وقت میں دروازے کے کواڑ کھول رہی تھی۔ جونہی وہ کھلے سلطان نے یہ کوشش کی کہ وہ مجھ سے پہلے اندر داخل ہو جائے۔ مگر میں نے اسے کہنی سے پرے دھکیل دیا۔ وہ میری اس اچانک حرکت کے لئے تیار نہیں تھا۔ اس لئے میں نے اسے بڑی آسانی سے چار قدم پرے ہٹا دیا۔ اور خود گھر کے اندر گھس کر فوراً پلٹ کر کواڑ بند کر کے چٹخنی چڑھا دی۔

"کیا آپ مجھے چائے کی ایک پیالی بھی نہیں پلائیں گی؟" سلطان نے کواڑوں کے پیچھے سے بڑے ہی میٹھے لہجے میں کہا۔

میں ایک لمحہ خاموش کھڑی رہی۔ دل میں خیال آیا۔ شاید زیادتی کر رہی ہوں۔ شاید یہ مرد ویسا نہ ہو جیسا میں اسے سمجھ رہی ہوں۔ مگر اگلے لمحے میں نے خود سے فیصلہ کن انداز سے کہا: "نہیں!" اور اونچی آواز سے مخاطب کر کے کہا: "آپ جائیے۔ میری طبیعت زیادہ خراب ہو رہی ہے۔"

اس نے جواب میں کچھ نہ کہا۔ پھر ایک دو لمحہ کی خاموشی کے بعد اس کے دروازے سے پرے ہٹتے ہوئے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔

جب میں سونے کیلئے بستر میں لیٹی تو میرا دل خوشی سے رقص کر رہا تھا۔ اگر میں سلطان کو گھر کے اندر آ جانے دیتی تو اپنے بارے میں یہ ثابت کر دیتی۔ کہ مجھے مستقیم سے محبت نہیں ہے۔ میری اس حرکت کا مطلب یہ ہوتا کہ میں مستقیم سے خود کو گھر پر چھوڑ دینے اور خود شہر شہر اڑنے پھرنے کا انتقام لے رہی ہوں۔ مجھے اس بات کی بڑی خوشی تھی کہ میں امتحان میں پوری اتری۔

میں نے اس رات سوتے میں کئی مرتبہ یہ خواب دیکھا کہ میں سلطان کے ساتھ کسی طرف جا رہی ہوں مگر چند قدم چلنے کے بعد سلطان کی شکل مستقیم کی شکل میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اگلے دن میں کافی دن چڑھے جاگی فون کی گھنٹی نہ جانے کب سے بج رہی تھی۔ میں نے سمجھا کہ مستقیم ہیں۔ اور خوشی خوشی ریسیور اٹھایا مگر ادھر سے حمیدہ بولی: "کیسی طبیعت ہے ملکۂ عالم کی؟"

میں نے کہہ دیا: "اب ٹھیک ہے۔"

"سلطان کہہ رہا تھا کہ وہ حضور کو آپ کے قصرِ معلیٰ تک پہنچانے گیا تھا۔ کیا اس کی یہ بات ٹھیک ہے؟"

"ہاں" میں نے جواب دیا: "ٹھیک ہے مگر۔۔۔!"

"مگر کیا؟"

"مگر یہ" میں نے کہا: "کہ اس نے میرے گھر کے اندر داخل ہونے کی کوشش کی تو میں نے اسے پرے دھکیل کر کواڑ اندر سے بند کر لیے۔"

"ارے اسے" حمیدہ نے ہنستے ہوئے کہا: "اتنی مردم بیزاری؟"

میں نے کہا: "تم اسے جو سمجھو کہہ لو۔ میں اسے کچھ اور نام دوں گی۔"

"بجا ہے حضور!" حمیدہ بولی: "میں نے بھی سلطان کو چٹکاتے میں آپ کی اس کارروائی کو یہی نام دیا تھا۔ یعنی شوہر کی محبت۔ وہ الو امریکہ سے نیا نیا آیا ہے۔ اس لئے اسے پتا نہیں کہ مشرقی عورت اپنے شوہر کی پرستار ہوتی ہے۔ وہ شوہر کی طرف سے تکلیفیں پہنچنے کے باوجود اسی کی اور صرف اسی کی رہتی ہے۔ یہی مشرقی عورت کی صفت ہے۔"

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو حمیدہ" میں نے کہا۔ اس وقت میری آنکھوں میں مسرت اور فخر کے آنسو تھے اور میرے ہونٹ جذبات کی شدت سے لرز رہے تھے۔

جب حمیدہ نے فون بند کر دیا تو میں نے مستقیم سے جو میرے تصویر میں میرے سامنے آ بیٹھا تھا مخاطب ہو کر کہا: "تم گھر کیوں نہیں آ جاتے؟"

"میں گھر آ گیا ہوں"۔ میرے شوہر نے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر قدم رکھتے ہوئے کہا۔

"اب بھی کیوں آئے؟" میں نے جلدی سے آنسو پونچھ ڈالے اور اپنے جذبات پر فوری قابو پا لینے کے بعد طنزیہ لہجے میں کہا

"اس لئے آیا" میرے شوہر نے میری طرف بڑھتے ہوئے کہا "کہ میری بیوی میری عدم موجودگی میں تنہائی محسوس کرتی ہے۔ اور میرا نام لیکر آنسو بھری آنکھوں اور لرزتے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ میرے تصویر سے باتیں کرتی ہے"

"اُوں"۔ میں نے ناک سکیڑی "کون کرتا ہے تمہارے تصویر سے باتیں!"

"یہ ـــ" میرے شوہر نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا ـــ میرے لئے اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ شرما کر منہ پھیرلوں۔ میرے شوہر نے میرے چہرے کو اپنے ہاتھ سے آہستہ سے اپنی طرف پھیرا اور کہا "تمہاری تنہائی کے خیال سے میں نے دورے کرنے کا کام اپنے ایک اسسٹنٹ کو منتقل کردیا ہے وہ کنوارہ ہے اس لئے اکیلا ہے۔ یہ کام اس کے لئے موزوں رہے گا۔

میرا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا۔ اس وقت وہ بلا مبالغہ یہی چاہ رہا تھا کہ میں اٹھ کر اپنے شوہر کے چمکتے ہوئے چہرے کی بلائیں لُوں مگر اس تبدیلی نیت سے اتنے جلد دست بردار ہونا آسان نہیں جو میں نے اس وقت اپنے اوپر طاری کر رکھی تھی۔ اس لئے صرف اتنا کہا "خدا کا شکر ہے کہ آپ کو اپنے شادی شدہ ہونے کا خیال آگیا اور آپ کی سمجھ میں یہ بات بھی آگئی کہ لمبے لمبے دورے کرنے کا یہ منحوس کام اسی مرد کے کرنے کا ہوتا ہے جس کا نہ گھر ہو نہ بیوی بچے ہوں!"

"مگر ـــ" میرے شوہر نے کہا "جو کام میں چلاتا رہا ہوں اسے اپنے اسسٹنٹ کو سمجھانے کیلئے مجھے ایک دورہ اور کرنا ہوگا"

"ضرور کیجئے" میں نے مسکراتے ہوئے مگر بظاہر بے اعتنائی سے کہا "میں جہاں آپ کے اتنے دوروں سے دکھ جھیل چکی ہوں وہاں یہ آخری دورہ بھی برداشت کرلوں گی"

"بس اس کے بعد پھر کبھی دورے پر نہیں جاؤں گا" میرے شوہر نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جن کے سامنے مجھے حیا کے مارے پسینہ آنے لگتا ہے۔ اور میں چائے بنانے کا بہانہ کرکے وہاں سے اُٹھ آئی۔

اس کے چند دن بعد میرے شوہر نے بتایا کہ کل وہ آخری دورے پر روانہ ہوں گے۔ اس روز حمیدہ بیگم ہمارے ہاں مہمان آئی ہوئی تھی۔ میرے شوہر نے اس سے اصرار کیا کہ وہ دو چار دن میرے ہی پاس رہے تاکہ میں شوہر اور سہیلی دونوں کے یکلخت چلے جانے سے تنہائی محسوس نہ کروں۔ حمیدہ نے ان سے وعدہ کر لیا کہ وہ ان کی واپسی تک یہیں رہے گی۔ اگلے دن میرے شوہر دورے پر روانہ ہو گئے۔

دوپہر کو میں اور حمیدہ بیٹھی باتیں کر رہی تھیں کہ فون کی گھنٹی بجی میں نے لپک کر رسیور اٹھایا کہ شاید مستقیم ہوں۔ لیکن اُدھر سے سلطان بولا "کہئے مزاج کیسے ہیں؟"

میں نے فوراً کہا "آپ فون بند کردیں۔ اور آئندہ مجھے فون ہرگز ہرگز نہ کریں"

اُدھر فون کھٹ سے بند کردیا گیا۔

حمیدہ نے پوچھا "کون تھا؟"

میں نے بتایا "وہی لاوارث لڑکیوں کا خریدار"

حمیدہ بہت ہنسی۔ پھر کہنے لگی "اس احمق کو شاید ابھی یہ معلوم نہیں ہے کہ مشرقی عورت کبھی یہ برداشت نہیں کرسکتی کہ اس کے شوہر اور اسکے درمیان کوئی غیر مرد آئے"

چند منٹوں بعد فون کی گھنٹی پھر بجی حمیدہ نے سمجھا سلطان ہے اس نے رسیور منہ کے قریب لے جا کر بڑے سخت لہجے میں پوچھا "کون ہے؟" مگر اگلے لمحے میری طرف دیکھ کر اس طرح زبان نکالی جیسے اس سے غلطی ہوگئی ہے اور رسیور میرے کان سے لگا دیا۔ ادھر مستقیم کہہ رہے تھے "میں نے وہ دورہ منسوخ کردیا ہے۔ کیونکہ یہ غیر ضروری ہوگیا ہے"

جونہی میں نے رسیور ہاتھ سے رکھا حمیدہ اُٹھتے ہوئے بولی۔

"اچھا بھئی ہم چلے" میں نے پوچھا "کیوں؟" کہنے لگی "ذرا اپنے مکھڑے کی رونق دیکھو آئینے میں۔ اور پھر سوچ کہ تیرا وہ گھر آرہا ہے جوش میں بھرا ہوا۔ کیا میں تیرے دوسرے ہنی مون کی زندہ پکچر دیکھنے کیلئے رکی رہوں" اور مجھے ہنستا چھوڑ کر باہر نکل گئی۔

افسانہ

مسز روحی عباس رضوی برمنگھم

گلاب کا پھول

روزا اور ٹیلفر ساحل کی گرم گرم ریت پر پاس پاس لیٹے تھے۔ ان کے جسموں پر اس وقت صرف پیراکی کے لباس تھے۔ گرم ریت کی ہلکی ہلکی حرارت روزا کو بہت اچھی معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے نہ دیکھنے کے انداز سے ٹیلفر کی طرف دیکھا۔ لمبا قد، چوڑا چکلا سینہ، سڈول بازو، جن کی مچھلیاں بازوؤں کے ریت پر دراز ہونے کی حالت میں بھی اس طرح ابھری ہوئی تھیں جیسے لوہے کی بنی ہوئی ہیں۔ روزا نے اپنے دل میں کہا "حسن اور طاقت کا دیوتا ہے!"

وہ اپنی فرم سے کچھ دن کی چھٹی لے کر جنوبی فرانس کے اس شاداب علاقے میں تفریح کرنے آئی تھی۔ اور ساحل سمندر کے کنارے اس ہوٹل میں مقیم ہوئی تھی۔ یہاں اس کی ٹیلفر سے ملاقات ہو گئی ایک دفعہ ملنے کے بعد روزا کا جی چاہا۔ کہ اس البیلے ترنگے وجیہہ مرد سے پھر بھی ملا جائے۔ جس نے اپنے بارے میں یہ بتایا تھا کہ ایک خود ساختہ خود پرداختہ نوجوان ہے۔ جس نے صرف اپنی محنت کے بل پر ترقی کی ہے۔

وہ اس وقت ایک ایسی فرم کا مینیجر تھا جو کپڑوں کی چھپائی کے ڈیزائن تیار کراتی تھی۔ اس کی اور باتوں کے علاوہ ایک یہ بات بھی روزا کے لئے کشش کا سبب بنی تھی۔ کہ وہ دونوں ہم پیشہ ہیں۔ وہ بھی ایک ایسی ہی فرم میں ملازم تھی۔ جو یہی کام کرتی تھی۔

روزا ٹیلفر سے دوبارہ ملی۔ اس وقت اس کے دل میں یہ خیال تھا کہ محبت کی جو دھیمی دھیمی آنچ اس کے سینے میں لہرانے لگی ہے اس جیسی کوئی آنچ ادھر نہیں لہرا رہی ہے۔ مگر ٹیلفر سے ملنے کے بعد اگلے ہی لمحے اسے معلوم ہو گیا کہ اس کا یہ خیال بالکل غلط ہے۔ ٹیلفر کی حسین آنکھوں میں ایک ایسی چمک تھی جو محبت کی آنچ ہی کی جھلک ہوا کرتی ہے۔

ایک دوسری ملاقات نے ان کے دلوں کے دروازے ایک دوسرے کے لئے کھول دیئے۔ دونوں گھنٹوں تک گرم گرم ریت پر لیٹے رہتے۔ ان کی نظریں آسمان کی خوشنما نیلی چھت سے لگی ہوئی ہوتیں مگر دلوں میں ایک دوسرے کا حسین چہرہ جلوہ پاشی کرتا ہوتا۔ اس طرح ایک دوسرے کی صورت کا نظارہ کرنا انہیں اتنا سہانا محسوس ہوتا کہ وہ گردن موڑ کر ایک دوسرے کو دیکھنا بھی غیر ضروری سمجھتے۔

"آؤ جی!" ٹیلفر اچانک اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اتنی پھرتی سے کہ اس کی یہ حرکت ظاہر ہی نہ ہوئی۔ "کچھ دیر پیراکی کریں۔ اس وقت سمندر میں جوار بھاٹا نہیں آ رہا ہے"

روزا بھی اس کی جسمانی پھرتی پر دل ہی دل میں حیرت کرتی ہوئی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اور آہستہ آہستہ کنارے کی طرف بڑھنے لگی مگر ابھی وہ چند ہی قدم چلی ہو گی کہ ٹیلفر بجلی کی طرح پانی کی طرف لپکا۔ اور اگلے لمحے روزا صرف یہ دیکھ سکی۔ کہ اس کا جسم پانی کی جانب اچھلا جس کے بعد ٹیلفر کا کہیں پتا نہ تھا۔ نہ ساحل پر نہ پانی کی سطح پر۔

روزا کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اور اس نے بے اختیار دونوں ہاتھوں سے دل تھام لیا۔ جو خوف اور اندیشے سے دھک دھک کرنے لگا تھا۔

پھر وہ چیخ مارنے ہی کو تھی کہ اتنے میں کچھ فاصلے پر موجوں میں سے ایک بڑا سا خوشنما انسانی سر ابھرا۔ اور اگلے لمحے ٹیلفر نے اپنے لمبے بھیگے ہوئے تانبے بالوں کو بلند شفاف مرمریں پیشانی پر سے ہٹاتے ہوئے

مسکرا کر روزا کی طرف دیکھا

روزا کو اس طرح چین سا پڑ گیا۔ جیسے اس کی روح جسم سے نکلی جا رہی تھی۔ وہ واپس آ گئی ہے۔ وہ بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑی اور اپنے چھوٹے چھوٹے گورے گورے حسین ہاتھوں سے تالیاں بجانے لگی۔ اس پر ٹیلفر نے بڑے زور سے قہقہہ مارا۔ اور لمبے لمبے ہاتھ پھینکتا ہوا کنارے کی طرف بڑھنے لگا۔

"آؤ" اس نے چلا کر روزا سے کہا۔

روزا کو ایسا محسوس ہوا۔ جیسے ٹیلفر کی پکار میں کوئی ایسی مقناطیسی کشش ہے جو اسے پانی کی طرف کھینچے لے رہی ہے۔ اسے کچھ پتا نہ چلا کہ کیا کر رہی ہے۔ اگلے لمحے وہ پانی میں تھی۔ چونکہ وہ پیراکی سے زیادہ ٹیلفر کے خیال میں محو تھی۔ اس لئے ڈبکیاں کھانے لگی۔ روزا خوب اچھی طرح تیرنا جانتی تھی۔ بلکہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس میں مشاق تھی مگر اس وقت محبت کی گہرائیوں میں غوطے کھا رہی تھی اس لئے سمندر کے پانی پر قابو نہ پا سکی۔

ٹیلفر نے روزا کو ایک ڈوبتی ہوئی کشتی کی طرح ہچکولے کھاتے دیکھا تو فوراً پانی کو چیر کر اس تک پہنچ گیا۔ اور اسے اپنی مضبوط بانہوں میں دبا کر کنارے کا رخ کرنے لگا۔

روزا پر اس خیال سے خوف چھا گیا تھا۔ کہ وہ ڈوبنے کو ہے مگر خوف زدہ ہونے کے باوجود وہ بے ہوش نہیں ہوئی تھی۔ اس نے ہوش و حواس ٹیلفر کو اپنے قریب پہنچتے اور خود کو اس کی بانہوں میں منتقل ہوتے دیکھا۔ البتہ مسرت کا جو احساس اس پر یہ نظارہ دیکھ کر طاری ہوا اس سے وہ نیم بیہوش سی ہو گئی۔ اور اس کی آنکھیں بند ہو گئیں

جب وہ ہوش میں آئی تو دیکھا۔ کہ ٹیلفر اس کا سر اپنے زانو پر رکھے اسے ہوش میں لانے کی ترکیبیں کر رہا ہے۔ روزا نے خود کو جس حالت میں پایا اس پر اسے بڑی حیا محسوس ہوئی۔ وہ فوراً اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اور اگلے لمحے سرو قد کھڑی ہو گئی۔ پھر بولی۔

"آؤ۔ اب ہوٹل چلیں۔ ورنہ کھانے کے وقت پر نہ پہنچ سکیں گے"

ٹیلفر پر جو جذباتی کیفیت طاری تھی۔ اس نے اسے گونگا سا بنا دیا۔ وہ جواب میں صرف سر ہلا سکا۔ اور روزا کے ساتھ ساتھ ہو لیا

ہوٹل کے برآمدے میں پہنچ کر اچانک روزا کی نظر ٹیلفر کی طرف اٹھ گئی۔ وہ روزا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کی بے حد پیاسی نظریں روزا کے چہرے کی آب و تاب سے اپنی تشنگی بجھا رہی ہیں۔ جب ان کی آنکھیں چار ہوئیں تو دونوں مبہوت ہو کر کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ اگر کوئی اس وقت ان دونوں کو اس حالت میں دیکھتا تو یقیناً یہی سمجھتا کہ انہیں سکتہ ہو گیا ہے۔

روزا کو ان لمحات میں ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے کوئی ان دیکھی طاقت اسے ٹیلفر کی طرف کھینچنے کی کوشش کر رہی ہے مگر دفعتاً کچھ مرد عورتیں باتیں کرتے ہوئے برآمدے کے اندر داخل ہوئے یہ طلسم ٹوٹ گیا روزا جلدی سے "گڈ بائی" کہہ کر اپنے کمرے کی طرف بھاگ کھڑی ہوئی اس وقت اس کے پاؤں کمرے کا رخ کرنے سے انکار کر رہے تھے۔ مگر روزا جوں توں وہاں تک پہنچ ہی گئی۔ اور کمرے کا دروازہ کھول کر اپنے بستر پر جا گری۔

مسرت اور انبساط کی ایک ایسی کیفیت نے، جو سمندر کی طرح اٹھا رہی تھی۔ اس کا دل بڑے زور زور سے دھڑک رہا تھا بلکہ دل ہی نہیں جسم کا ایک ایک رواں مسرت کے وفور میں رقص کرتا معلوم ہوتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے ساحل کی ریت پر ہوش میں آتے وقت ٹیلفر کی زبان سے جو الفاظ ادا ہوتے سنے تھے انہوں نے اسے ٹیلفر کے بارے میں یہ یقین دلا دیا تھا کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ اسے ہوش میں آتے دیکھ کر ٹیلفر نے اپنی زبان روک لی تھی اور چوروں کی طرح اس کا منہ تکنے لگا تھا۔ شاید روزا کے خیال میں اس لئے کہ اسے اندیشہ تھا۔ صرف دو ملاقاتوں میں اقرار محبت کرنے سے یہ لڑکی اس کے ارادوں پر شبہ کرنے لگے گی۔ مگر روزا تو پہلے ہی سے اپنا دل اس کی نذر کر چکی تھی۔ اسے شبہ کرنے کی ہمت ہی نہ ہو سکتی تھی۔

"یہ سب محض جذباتی باتیں ہیں" روزا نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے خود سے کہا "یہ ایک تفریح گاہ کا وقتی رومان ہے جو بہت جلد ختم ہو جائے گا۔"

"میں تم سے مانچسٹر میں ملوں گا" تفریح گاہ سے رخصت ہوتے وقت ٹیلفر نے روزا سے بڑے پُر ارمان لہجے میں کہا۔

مگر روزا پر جذبات کا اتنا غلبہ تھا کہ وہ جواب میں ایک لفظ بھی نہ کہہ سکی، صرف سر ہلا کر رہ گئی۔

ٹیلفر کہہ رہا تھا "یہ بات بڑی عجیب ہے اور ایک طرح سے خوش قسمتی کی بات بھی ہے۔ کہ ہم دونوں مانچسٹر کے ہیں اور ایک ہی پیشے سے تعلق رکھتے ہیں۔"

روزا نے زبان سے تو اب بھی کچھ نہ کہا۔ مگر اس کا دل دھک دھک کرتے ہوئے اپنی زبان میں کہہ رہا تھا۔ میرے لئے تو سب سے بڑی خوش نصیبی یہ ہے کہ تم میرے دل میں آن بسے ہو۔ اور جس طرح مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے اسی طرح تم کو بھی مجھ سے محبت ہے

ٹیلفر سے جدا ہوتے وقت اس کا دل درد کی شدت سے پھٹا جا رہا تھا چونکہ ٹیلفر کے ہونٹوں پر تبسم تھا اس لئے وہ بھی کوشش کر کے مسکراتی رہی

اپنے گھر واپس پہنچنے کے بعد اس نے اپنی سہیلی ماڈ کو ساری داستان سنائی۔ اس نے مسکراتے ہوئے مبارکباد دی۔ مگر یہ کہا۔ کہ ابھی بات پکی نہیں سمجھنی چاہیئے۔ پہلے اس کا فون یا خط آنے دو۔ اس میں وہ ملاقات کی کوئی تاریخ مقرر کرے گا۔ یا تو تم کو کہیں بلائے گا یا خود تمہارے پاس آئے گا۔ اور نہیں شادی کا پیغام دے گا۔ پھر کہیں جا کے یہ سمجھنا کہ محبت کا چاند حالات کے آسمان سے تمہارے گھر میں اُتر آیا ہے۔ ابھی خود کو بے قابو نہ کرو۔ مردوں کا کچھ ٹھیک نہیں۔ بعض مرد مرغِ بادنما کی طرح آن کی آن میں بدل جایا کرتے ہیں۔"

ماڈ روزا کی عزیز ترین سہیلی تھی۔ روزا اس کی ہر بات مانتی آئی تھی مگر اس صلاح پر یقین نہ کر سکی۔ گو زبان پر یہ بات نہ لائی کہ وہ ٹیلفر کی نیت پر شبہ کرنے کو تیار نہیں۔

مگر کافی دن گزر جانے کے بعد بھی ٹیلفر نے نہ تو فون کیا نہ اسے خط لکھا ــــ ایک دن ماڈ۔ روزا سے ملنے آئی تو اس نے ادھر اُدھر کی دو چار باتیں کرنے کے بعد روزا سے پوچھا "تمہارے شہزادہ محبت کا نام کیا ہے؟"

روزا نے ہلکے سے تیوری چڑھا کر اس کی طرف دیکھا (وجہ یہ تھی کہ وہ اسے شہزادہ محبت کا نام بتا چکی تھی) پھر بولی "اس کا نام ٹیلفر ہے۔ میں تمہیں بتا تو چکی ہوں۔"

"پورا نام بتاؤ۔" ماڈ نے پوچھا

"پورا نام ہے۔" روزا نے اپنی سہیلی کی طرف عجیب نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "پال ٹیلفر۔ کیوں کیا بات ہے؟"

ماڈ کہنے لگی "لندن سے ایک اخبار نکلتا ہے جس میں شادی بیاہ وغیرہ کے بارے میں خبریں چھپا کرتی ہیں۔"

روزا کا دل کسی نامعلوم اندیشے سے بڑے زور سے دھڑکا۔

ماڈ کہہ رہی تھی۔ اس اخبار کے تازہ ترین شمارہ میں پال ٹیلفر اور کسی بلینڈا مرجز کی دوستی کے بارے میں خبر چھپی ہے۔ اس میں بلینڈا کے متعلق یہ بتایا گیا ہے کہ وہ کسی مالدار صنعت کار کی بیٹی ہے میرا خیال ہے کہ پال ٹیلفر وہی مرد ہے جس پر تم فدا ہو۔ میں نے کہا نہیں تھا کہ مردوں کا کوئی اعتبار نہیں "

مگر روزا نے ماڈ کی یہ بات تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ کہ اس کا ٹیلفر دل کے لین دین کے بعد بھی اس سے پھر گیا ہے۔ ماڈ نے کہا تھا۔ کہا ہو گا۔ وہ کہتی ہی ہے، کہتی رہے۔ مگر روزا کے لئے یہ ناقابل یقین تھا۔ کہ ٹیلفر کسی مالدار صنعت کار کی بیٹی کے لئے اسے چھوڑ دے گا۔

اور اس کے دو ایک دن بعد ٹیلفر اس سے ملنے بھی آگیا

ٹیلفر نے اخباری خبر کے بارے میں اسے بتایا کہ یہ صرف گپ ہے۔ وہ کسی صنعت کار کی لڑکی سے شادی نہیں کر رہا ہے

روزا نے ماڈ کو نئی صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ اور اسے بتایا کہ کس طرح وہ اپنی عزیز ترین سہیلی کی بات ماننے کو اسی لئے تیار نہیں ہوئی تھی۔ کہ اسے اپنے ٹیلفر کی محبت پر اعتماد تھا۔

ماڈ نے کہا "خدا کرے ایسا ہی ہو کہ میرا شبہ بے بنیاد نکلے مگر میں پھر کہتی ہوں کہ مردوں پر اعتماد نہیں کرنا چاہیئے (اور ان سے چوکس رہنا چاہیئے"

مگر اب کے روزا نے علی الاعلان اس کی یہ بات رد کر دی اس کے بعد ٹیلفر اور روزا کی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔

مگر اس نے ماڈ سے جب کبھی رفتارِ حالات کا ذکر کیا اس نے محتاط رہنے کی صلاح دی۔ جسے روزا نے ناک بھوں چڑھا کر رد کر دیا۔

پھر ملاقاتوں کا جوش سرد پڑنے لگا ٹیلفر کی طرف سے، پھر ملاقاتیں

ملتوی ہونے لگیں۔

ایک مرتبہ جب متعین کی ہوئی ملاقات کو وہ فون پر منسوخ کرنے لگا تو روزا نے جل کر کہا "شاید بلینڈا سے ملنا ہوگا؟"

اس کو یقین تھا۔ ٹیلفر کہے گا "نہیں نہیں یہ بات نہیں ہے" مگر ٹیلفر نے کہا "تو تم کو بلینڈا کے سلسلے میں معلوم ہو چکا ہے" اور اس کی آواز سے اطمینان ٹپک رہا تھا۔

"پہلے معلوم نہیں تھا" روزا نے چیخ کر کہا "مگر اب معلوم ہوگیا گڈ بائی" اور اس نے فون کا ریسیور کریڈل پر اس طرح دے پٹخا جیسے اس سے ہاتھ جل رہا ہے۔

اگلے دن ایک مقامی اخبار میں یہ خبر چھپی کہ مسٹر پال ٹیلفر کی منگنی مس بلینڈا مرجز سے طے پا گئی ہے۔ اس خبر میں یہ بھی تھا کہ اس رشتے سے دو صنعت کار فرموں میں ایک رشتۂ اتحاد قائم ہو جائے گا۔ خبر کے ساتھ بلینڈا کی تصویر بھی تھی۔ ایک حسین نازک اندام لڑکی ٹیلفر کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

روزا اس نتیجے پر پہنچی کہ صنعت کاروں اور صنعتی فرموں کے ملازموں کے نزدیک شادی بھی ایک طرح کا لین دین ہوتا ہے چنانچہ اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب اس صنعتی فرم میں ملازمت نہیں کرنی جس میں اتنے عرصے سے کام کرتی آ رہی ہے۔ اس نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ اور اپنی بہن مورین کے گھر مہمان جا ٹھہری جس کے ہاں دوسرا بچہ ہونے کو تھا۔

اس کے وہاں پہنچنے کے ایک ہفتہ کے بعد مورین کے ہاں لڑکا ہوا۔ روزا کو بھانجہ بہت پسند آیا۔ اور اسے اپنی بہن کی گود میں دیکھتی تو اپنی غیر شادی شدہ زندگی کا خیال کر کے اس کے سینے میں ایک ہوک اٹھتی — ایک دن اس نے اپنی بہن سے کہا "میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں شادی نہیں کروں گی"

"نہیں نہیں" اس کی بہن نے فوراً اس کی بات کی تردید کی "تمہیں اس قسم کا فیصلہ ہرگز نہیں کرنا چاہیئے۔ شادی کے بغیر عورت کی زندگی نامکمل رہتی ہے"

"مگر" روزا بولی "شادی کے لئے مرد کی ضرورت ہوتی ہے اور مرد بے اعتبار ہوتے ہیں"

"سب مرد بے اعتبار نہیں ہوتے" اس کی بہن نے کہا "تم اس ٹیلفر کو بھول جاؤ۔ وہ احمق اس قابل نہیں تھا کہ تمہارا رفیق زندگی بن سکے۔ بہت جلد تمہیں کوئی صحیح قسم کا رفیق بھی مل جائے گا"

"نہ میں ٹیلفر کو یاد کرتی ہوں" روزا بولی "نہ مجھے اب کسی اور صحیح یا غلط قسم کے مرد کی تلاش ہے میں تو اب شادی ہی نہیں کروں گی میں نے کالج آف ڈیزائن میں ملازمت کے لئے درخواست بھیجی تھی وہ منظور ہو گئی ہے۔ مزے سے نوکری کروں گی اور خوشی سے وقت گزاروں گی"

اور اگلے چار برس تک روزا یہی کرتی رہی۔ اس کی زندگی ایک آزاد اور خود مختار عورت کی زندگی تھی۔ اس نے کار چلانا سیکھ لیا سوشل تقریبات میں اکیلی شریک ہوتی۔ ریسٹورانوں میں اکیلی کھانا کھاتی اکیلی سفر کرتی۔ اکیلی ہی گھر چلاتی۔ اور جو مرد دوستانہ میل جول رکھنا چاہتے ان سے برابری کی حیثیت سے ملتی۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

مگر ایڈم فین وک اس کے علاوہ اور کچھ بھی چاہتا تھا۔ روزا نے اس کا خط پڑھا۔ تو اس کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ اس نے اپنا ہاتھ ایک جھٹکے کے ساتھ آگے بڑھا کر پین اٹھایا اور ایک پرزے پر جلدی جلدی لکھا۔

"ڈیر مسٹر ایڈم

میں جمعہ کے روز تیسرے پہر کو چار بجے آپ کے دفتر پہنچ جاؤں گی تاکہ ہم اس منصوبے پر گفتگو کر سکیں جو آپ کے پیش نظر ہے مگر مجھے افسوس ہے کہ میں اس ملاقات سے قبل لنچ کی دعوت قبول نہیں کر سکتی۔

خلوص کار — روزا میڈالین"

مسٹر ایڈم فین وک کا ایک کارخانہ تھا جو طلبا کپڑوں کے ڈیزائن بنانے کی خواہش ظاہر کرتے تھے یہ کارخانہ ان کی ہمت افزائی کرتا تھا اور جو ڈیزائن اس کے ماہر پسند کر لیتے تھے انہیں خرید بھی لیتا تھا۔ اس نے گزشتہ دو سال میں روزا کے بھی کئی ڈیزائن خریدے تھے روزا اس کارخانے کے مالک ایڈم سے بس اتنا ہی تعلق رکھنا

چاہتی تھی۔ اس سے آگے جانے کو تیار نہ تھی۔ مگر ایڈم آگے جانے پر مُصر تھا۔ جمعے کے دن، جب اگلی ٹرم کے لئے طلبا کے بنائے ہوئے ڈیزائنوں کے بارے میں معاملے کی بات مکمل ہو چکی تو ایڈم نے اپنی گردش کرنے والی کرسی کی پشتی سے پیٹھ لگائی اور کہا۔

"آپ کا بہت بہت شکریہ مس روزا۔ آپ نے زیرِ غور منصوبہ کے تمام مسائل کو بڑی خوش اسلوبی سے سلجھا دیا!"

روزا نے اپنے ہاتھوں پر دستانے چڑھاتے ہیں سوچا۔ ایڈم بڑی پُرکشش شخصیت کا آدمی ہے۔ لمبا تڑنگا، خوش گلو، خوش گفتار مگر پھر یکلخت اس نے خود کو روکا۔ بس بس۔ جب ذہن کسی مرد کی خوبیاں شمار کرنے لگے۔ تو اس کی طرف سے توجہ ہٹا لینی چاہیئے ورنہ!

"مجھے خوشی ہے۔" اس نے ایڈم سے مخاطب ہو کر کہا۔ "کہ آپ مطمئن ہو گئے۔"

"جی ہاں!" ایڈم بولا۔ "میں اس پہلو پر تو مطمئن ہو گیا ہوں مگر مجھے اس کا افسوس ہے کہ آپ نے میری لنچ کی دعوت قبول نہیں کی۔ میں یہ توقع کر رہا تھا کہ اس سے تعلقات کا ایک نیا دروازہ کھلے گا۔ اور ہم کاروباری باتوں سے آگے بڑھ سکیں گے۔" اور وہ روزا کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ ایک بے حد دلکش اور دلفریب مسکراہٹ۔

روزا اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اور اس نے اپنا دایاں ہاتھ بڑھا کر قریب کی میز پر سے اپنا چرمی ہینڈ بیگ اٹھاتے ہوئے کہا۔ "میں کاروبار اور تعلقات کو ایک دوسرے سے بالکل الگ رکھنے کی قائل ہوں۔"

"بہت مناسب روش ہے۔" ایڈم نے داد دی۔ پھر ایک لمحہ تامل کے بعد کہنے لگا۔ "مگر شاید آپ کو میرے ساتھ ڈنر کھانے پر تو اعتراض نہ ہوگا۔ کل رات تشریف لے آیئے۔" ایک لمحہ کیلئے روزا کا دل چاہا کہ وہ ایڈم کی دعوت قبول کرے اس کی نرم دل دبیدہ دنیا میں اتنے خلوص کی بہار سالہا سال سے نہیں آئی تھی ایڈم کہہ رہا تھا۔ "ڈنر کے دوران میں میں کوئی کاروباری بات ہرگز ہرگز نہیں کروں گا مگر اوروں کی ضمانت نہیں دے سکتا خاندان کے چھوٹے بڑے سب جمع ہوں گے شاید ڈیڈی آپ سے آپ کے بنائے ہوئے ڈیزائنوں کے بارے میں گفتگو کرنے لگیں وہ اپنے پسندیدہ انسانوں سے بہت جلد گھل مل جایا کرتے ہیں اور اس کا مجھے یقین ہے کہ آپ ان کی پسند کی خاتون ثابت ہوں گی۔

خاندان کے چھوٹے بڑے سب جمع ہوں گے۔" روزا نے اپنے دل میں ایڈم کے الفاظ دہرائے۔ پھر اس نے سوچا۔ "ایڈم خاندانی آدمی ہے۔ اس کی زندگی میں کوئی نہ کوئی بڑی حسین وجمیل لڑکی بھی ضرور ہوگی جو قیمتی ہیلمٹ گراؤنڈ رکھتی ہوگی۔ . . ."

"مجھے افسوس ہے۔" اس نے ایڈم کی درخواست رد کرتے ہوئے کہا۔ "کہ کل رات مجھے اپنی ایک سہیلی کے ہاں دعوت میں شریک ہونا ہے اس لئے معذور ہوں۔"

"پرسوں سہی۔" ایڈم انکار قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔

"پرسوں ایک اور تقریب میں شرکت کرنی ہے۔" روزا نے ایک بار پھر ٹالا۔

"اترسوں؟" ایڈم ہار ماننے والا مرد نہیں تھا۔

"اترسوں ایک دوست نے مدعو کر رکھا ہے۔"

"بڑا خوش نصیب ہے وہ شخص۔" ایڈم نے بلکے سے سرد آہ کھینچی مگر اسے یہ خیال نہیں تھا کہ اترسوں ہفتے کا دن تھا۔ اور روزا ہر ہفتے کو پورا دن اپنی پھوپھی بیسٹ کے پاس گزارتی تھی۔ جو ایک وادی کے نشیب میں کوٹھی بنوا کر وہاں رہنے لگی تھیں۔ گرمیوں میں وہ جگہ جنت معلوم ہوتی تھی۔ مگر اس موسم میں جبکہ بلا کی سردی پڑنی شروع ہو گئی تھی۔ ویرانہ سی نظر آنے لگتی تھی۔ کیونکہ آبادی سے میلوں دور واقع ہوئی تھی۔

"اچھا۔" روزا نے دروازے کا رخ کیا۔ "گڈ بائی!"

ایڈم نے اس کے جواب میں ایک لمبا سانس اندر کھینچا اور پھر گال پھلا کر اسے خاصی طوالت سے باہر نکالا۔ پھر بولا۔ "اچھا گڈ بائی۔"

روزا کا دل اس کی دعوت قبول کرنے کیلئے مچلنے لگا۔ کیسا پُرکشش مرد ہے، کتنا مخلص ہے۔ اس کا دل نہیں توڑنا چاہیئے۔" وہ کچھ کچھ پگھلنے لگی۔ اور کہنے ہی کو تھی کہ وہ اترسوں رات کے لیے اس کی ڈنر کی دعوت قبول کرتی ہے مگر اگلے لمحے اس کے شعور نے احتجاج کیا۔ ایک بار چوٹ کھا چکی ہے۔ اب پھر ایک مرد کی باتوں میں آنے لگی۔

روزا تیز تیز چلتی ہوئی ایڈم کے دفتر سے باہر نکل آئی اور دل ہی دل میں کہا۔ "رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت۔" اور اب اس سے کئی مہینے تک

سامنا ہونے کی نوبت ہی نہ آئے گی۔"

مگر ایڈم میں کچھ ایسی بات تھی۔ کہ اتنے عرصے بعد ملنے کے خیال سے اس کا دل خوش نہیں ہوا۔

روزا نے ایڈم کا خیال دل سے نکالتے ہوئے اپنی پھوپھی بیٹ پر توجہ مرکوز کرنے کی کوشش کی۔ آسمان پر جس طرح گھنگھور گھٹائیں سب طرف چھائی ہوئی تھیں۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ محکمہ موسمیات کی برفباری کی پیش گوئی حرف بحرف صحیح ثابت ہوگی۔ روزا نے سوچا۔ کار میں نہیں جانا چاہیئے۔ بلکہ بس سے سفر کرنا چاہیئے۔ بس بھی پھوپھی بیٹ کی کوٹھی کے بالکل قریب اُتارے گی۔

جب بس اس وادی میں داخل ہوئی جس میں اس کی پھوپھی کی کوٹھی تھی بس کنڈیکٹر نے اعلان کیا "یہ بس صرف ٹھقری لین کے اسٹاپ تک جائے گی۔ اور وہاں سے اوکین گل کی طرف مڑ جائے گی"

روزا چونکی اس نے کنڈیکٹر سے پوچھا "تو یہ بس کینگر کے بس اسٹاپ تک نہیں جائے گی؟" اس اسٹاپ سے پھوپھی بیٹ کی کوٹھی صرف چند قدم کے فاصلے پر تھی۔

"جی نہیں" کنڈیکٹر نے جواب میں کہا "ہم آپ کو اس اسٹاپ سے ایک میل ادھر ہی اتار سکتے ہیں۔"

"کیوں" روزا نے بڑی تشویش سے پوچھا۔

"یوں" کنڈیکٹر نے بتایا "کہ ٹھقری لین کے اسٹاپ سے آگے اوکین گل تک جانے والی سڑک برف سے اٹی ہوئی ہے"

روزا نے کھڑکی کے شیشے کا دھند صاف کر کے باہر کی طرف زیادہ سے زیادہ گھور کر دیکھا۔ دور دور تک برف گر رہی تھی اور زمین حد نظر تک سفید پڑ چکی تھی۔

کنڈیکٹر اس کی معلومات میں اضافہ کرنے کے لئے کہہ رہا تھا۔

"کل سہ پہر سے اس علاقے میں لگاتار برف گر رہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم ٹھقری لین کے اسٹاپ تک بھی شاید ہی پہنچ سکیں۔ کیونکہ ہمارے وہاں پہنچتے پہنچتے ادھر کے راستے کا بہت سا حصہ برف سے ڈھک چکا ہوگا۔ اور اس وقت بس میں تنہا مسافر آپ ہی ہیں اس لئے"

روزا نے گھبرا کر اس کی بات کاٹی "اگر میں ٹھقری لین کے اسٹاپ پر اتر جاؤں تو کیا وہاں سے ڈیل کاٹیج تک پہنچ جاؤں گی؟" اور اس نے ایک بار پھر برف سے ڈھکی ہوئی سڑک کی طرف دیکھا۔

کنڈیکٹر کہہ رہا تھا "میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ ویسے میں آپ کو یہی صلاح دوں گا۔ کہ آپ بس سے قدم نیچے نہ اُتاریں۔ اور شہر واپس چلی چلیں" اس نے روزا کی طرف دیکھتے ہوئے وسل ہونٹوں کو لگائی کہ اگر وہ اس کی صلاح ماننے کو تیار ہو تو وہ ڈرائیور کو واپسی کا حکم دے دے۔

"نہیں!" روزا نے اسے جواب دیا "میں ٹھقری لین کے اسٹاپ پر اتروں گی"

"اور وہاں سے" کنڈیکٹر نے حیرت اور خوف سے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا "ڈیل کاٹیج تک جائیں گی؟ برف کو کھوندتی ہوئی؟"

ادھر روزا خود سے کہہ رہی تھی "اگر میں شہر واپس چلی گئی۔ تو پھوپھی بیٹ برف سے گھرے ہوئے اس ماحول میں اکیلی رہ جائیں گی۔ اس صورت میں خبر نہیں ان پر کیا گزر جائے"

جب ٹھقری لین کا بس اسٹاپ آیا تو وہ اپنا ہینڈ بیگ اٹھا کر بس سے اتر گئی۔

کنڈیکٹر نے اس سے کہا "ہم زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے میں لوٹ آئیں گے۔ اگر آپ شہر واپس چلنا چاہیں تو اس وقت تک سٹاپ پر پہنچ جائیں"

روزا نے اس کا پیشگی شکریہ ادا کیا۔ اس وقت وہ جس جگہ کھڑی تھی وہاں بھی اتنی برف تھی کہ اس کی ٹانگیں پنڈلیوں تک برف میں دھنس چکی تھیں۔ جب وہ برف کی پناہ گاہ سے محروم ہوگئی تو برف کی نکیلی کنکریوں نے جو آسمان سے ترچھی گر رہی تھیں۔ شمال مشرقی کی ہوا کے تیز جھونکوں پر اڑتے ہوئے اس کی خبر لینی شروع کر دی۔

روزا بڑی احتیاط سے قدم اٹھاتے ہوئے اس پتلی سی لیکھ پر چلنے لگی۔ جو برف کی سفید سفید سطح پر بس کے پہیوں سے بن گئی تھی مگر حیران تھی کہ بس کا پتا کس طرح چلا سکے گی۔

بہرحال وہ جوں توں اس جگہ تک پہنچ گئی۔ جہاں سڑک ڈیل کاٹیج

کی جانب مڑتی تھی۔ مگر وہاں اسے کوئی موڑ نظر نہ آیا۔ صرف برف کی ایک سفید سفید دیوار تھی جو ایک موٹی اور چوڑی برفانی لہر کی طرح مڑ گئی تھی۔ اور وہ بھی اسے گزرتی ہوئی ایک کار کی اگلی روشنی پڑنے سے دکھائی دے گئی۔ ورنہ اس وقت فضا جس سفید اندھیرے میں لپٹی ہوئی تھی اس میں تو کچھ بھی نظر نہ آتا تھا۔

اس نے خود سے سوال کیا "اب اس دیوار کی اس طرف کیسے پہنچوں"

ایک ہی تدبیر ممکن نظر آئی اور وہ یہ کہ وہ اس پر چڑھ کر دوسری طرف اتر جائے۔ مگر اس پر چڑھنے کا مطلب تھا برف کے اس تودے میں دھنس جانا۔ سوال یہ تھا کہ اگر وہ خود اس میں سے باہر نکل سکی۔ تو پھر کیا ہوگا؟ یہاں تو کوئی متنفس نظر نہیں آتا جس کو مدد کے لیے بلائے گی۔

ادھر روزا اس گو مگو کے عالم میں ساکت کھڑی تھی ادھر برف کا وہ تودا، جس سے اسے گزرنا تھا ہر لمحہ زیادہ اونچا ہوتا چلا جا رہا تھا۔ آخر وہ ہمت کر کے اس پر چڑھ گئی مگر وہی ہوا جس کا اسے ڈر تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ کمر تک برف میں دھنس گئی۔ اس نے بڑا زور لگایا مگر برف اسے اگلنے کے لئے کسی طرح تیار نہ تھی۔ اس نے اپنا ہینڈ بیگ برف پر دے مارا، بار بار اپنے دستانہ پوش مکوں سے اسے توڑنا چاہا اور جب یوں کام نہ بنا تو اپنے جسم کو زور زور سے جھٹکے بھی دیئے مگر برف سے چھٹکارا نہ ملنا تھا نہ ملا ــــ اچانک نہ جانے کہاں سے ایک بڑا سا کالا کالا ہیولا اس کے سامنے نمودار ہو گیا۔

"ارے آپ!" ایک گوش آشنا آواز سنائی دی "آپ یہاں کیا کر رہی ہیں" یہ آواز ایڈم فین وک کی تھی۔

روزا کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ برف میں گڑ جائے گی اسے بھی شرم آ رہی تھی۔ لو سامنا بھی ہوا تو کس سے۔ ایڈم سے! یہ اپنے دل میں کیا کہہ رہا ہوگا۔ یہی کہ میں نے اس سے دروغ بیانی کی تھی۔ مگر پھر بھی اس نے دیدہ دلیری دکھاتے ہوئے کہا "یہی سوال میں آپ سے بھی پوچھ سکتی ہوں"

"ضرور پوچھیئے۔" کہہ کر ایڈم نے ایک قہقہہ مارا۔ "اور میرا جواب یہ ہے کہ میں نے وہ سامنے والی کوٹھی اس لئے خریدی تھی کہ قریب کی جھیل میں مچھلی کے شکار کا لطف اٹھایا کروں گا مگر یہ معلوم نہیں تھا کہ یہاں جاڑے کے موسم میں اتنی سخت برف باری ہوتی ہے۔"

"اسی عدم واقفیت کا شکار میں بھی ہوئی ہوں۔" روزا نے کہا۔ "میں ڈیل کا ٹیج پہنچنے کے قصد سے آئی ہوں۔ آپ کی کار کی ڈکی میں پھاوڑا تو نہیں ہوگا۔ اگر ہو تو تکلیف کر کے نکال دیں!"

دو منٹ بعد ایڈم پھاوڑا کار کی ڈکی سے نکال کر برف کھود رہا تھا اور بہت جلد اس نے روزا کے لئے ڈیل کاٹیج تک سڑک صاف کر دی۔ اس واقعے کے آدھ گھنٹہ بعد روزا کی پھوپھی نے اس سے پوچھا "تمہیں کوٹھی تک جس نے پہنچایا اس کا کیا نام بتایا تم نے مجھے یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی ہے کہ کوئی مرد تمہیں یہاں تک پہنچانے آیا تھا۔ وہ بڑا شریف اور دردمند انسان معلوم ہوتا ہے"

روزا نے کہا "اس کا نام ایڈم فین وک ہے۔ وہ میرا ایک کاروباری دوست ہے اور آجکل آپ کا ہمسایہ ہے"

"تم نے اس سے گھر کے اندر آنے کی درخواست نہیں کی؟"

"میں کرتی بھی تو وہ نہ آتا!"

"کیوں؟" روزا کی پھوپھی نے اسے گھورا "اگر اسے کچھ عقل ہے تو کل صبح وہ یہاں آئے گا۔ اور اگر تم میں کچھ عقل ہے تو تم اسے یہاں آنے کی دعوت دو گی"

"بس کیجئے پھوپھی جان!" روزا نے تنک کر کہا "آپ مجھے شادی کے جھمیلے میں نہ پھنسایئے"

"چلو چلو" پھوپھی نے اسے جھڑکا "فضول باتیں نہ کرو۔ اچھے مرد بار بار ہاتھ نہیں لگا کرتے۔ میں نے ایک اچھے مرد کو قبول نہ کر کے جو غلطی کی تھی اس کا خمیازہ آج تک بھگت رہی ہوں۔ اس جیسا اچھا مرد پھر کبھی ملا ہی نہیں۔ سناؤں تمہیں اپنی داستان!"

"ہاں" روزا نے کہا "ضرور سنایئے"

اس کی پھوپھی کہنے لگیں "اس مرد کا نام تھا فرینک، وہ بڑا نیک دردمند مخلص نوجوان تھا۔ اسے مجھ سے دلی محبت تھی اور یہی حال میرا بھی تھا مگر میں اپنے ماں باپ کی آخری اولاد تھی۔ اور آٹھ بھائیوں میں اکیلی لڑکی تھی۔ اس لئے میں اپنا فرض سمجھتی تھی کہ اپنے بوڑھے اور عمر رسیدہ ماں باپ کی خدمت کروں۔ میں نے فرینک سے صاف کہہ دیا کہ میں والدین کی خدمت کو شادی پر ترجیح دیتی ہوں۔ فرینک ایک عرصے تک میرے سر رہا

مگر جب میں کسی طرح راضی نہ ہوئی تو وہ مایوس ہو کر کہیں دوسرے ملک نکل گیا"

روزا کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اسے بے اندازہ ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔ مگر یہ فیصلہ نہ کر سکی کہ کس سے؟ اپنی پھوپھی سے یا اس نوجوان فرینک سے جس کی زندگی پھوپھی کی سنگدلی کی وجہ سے برباد ہو گئی تھی۔ اس کی پھوپھی کہہ رہی تھیں "میں نے فرینک کی زندگی برباد کر دی، محض اپنی ضد سے، میں نے ایک سنگین جرم کیا۔ میری اداس اور تنہا زندگی ہر نوجوان لڑکی کے لئے ایک سبق ہے۔ اگر تم کو کوئی دردمند اور مخلص نوجوان مل رہا ہے جسے تم سے محبت ہے تو اسے ہرگز نہ ٹھکراؤ"

جب پھوپھی سو گئیں تو روزا آتش دان کے آگے بیٹھی سوچتی رہی ایڈم دردمند تو ہے۔ اس نے میرے کہتے ہی پھاوڑا کار کی ڈکی سے نکال کر برف کھودنی شروع کر دی۔ اور ڈیل کاٹیج تک کا تمام راستہ صاف کر کے دم لیا۔ اس کے علاوہ وہ مخلص بھی ہے۔ اس کا خلوص اس کے چہرے ہی سے نہیں اس کی بات بلکہ ہر بات کے ہر لفظ سے ٹپکا پڑتا ہے اور یہ خیال کر کے کہ ایڈم کو اس سے محبت ہے۔ روزا کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اس نے اپنے لال بھبوکا رخساروں کو اپنے گورے گورے نازک ہاتھوں میں چھپا لیا۔ مگر سوال یہ تھا کہ ایڈم جیسا حساس اور خوددار آدمی اس کی دعوت قبول بھی کرے گا یا نہیں؟

اس سوال کا جواب یہ تھا۔ کہ شاید نہ کرے۔ پہلے اس کی دعوت رد کی جا چکی ہے۔ ایسے کے اس کی باری ہے اب وہ ڈیل کاٹیج میں آنے سے انکار کر دے گا" احسان کا بدلہ احسان!

غرض روزا کو یقین نہیں تھا کہ اگر اس نے ایڈم کو ڈیل کاٹیج میں چائے پینے یا لنچ کھانے یا ڈنر میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ تو وہ اسے قبول کرے گا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ اس کی پھوپھی کو کامل یقین تھا۔ کہ اگر وہ باتیں جو روزا نے اس کے بارے میں بتائی ہیں صحیح بتائی گئی ہیں۔ تو وہ روزا کے معمولی سے اشارے پر ڈیل کاٹیج آ جائے گا۔

روزا نے پھوپھی پر ایک بار پھر یہ تو واضح کر دیا کہ اس نے ایڈم کے بارے میں جو کچھ ان سے کہا ہے اس کا ایک ایک حرف صحیح ہے مگر یہ بات ظاہر کرنے کی جرأت نہ کر سکی۔ کہ ایڈم نے اسے پہلے لنچ اور پھر ڈنر کی دعوت دی تو اس نے دونوں مرتبہ دعوت ایسے بہانے کر کے ٹھکرا دی جن کا بے بنیاد ہونا عیاں تھا۔

یوں روزا کے لئے ایک ایسی مشکل پیدا ہو گئی۔ جو کسی برفانی دیوار سے بھی زیادہ ناقابل عبور تھی۔

اگلے دن، صبح ناشتے کے وقت تک روزا مختلف کام کاج کرتے کے دوران میں بھی اس مسئلے پر غور کرتی رہی۔ اس کا دماغ بار بار یہی فیصلہ سناتا تھا۔ کہ ایڈم اس کی دعوت کو رد کر دے گا۔ اور ساتھ ہی دل ہی دل میں ہاتھ مل کر رہ جاتی تھی۔

ناشتے پر پھوپھی نے اس سے پوچھا "تم ایڈم کو دعوت دینے گئی نہیں"

روزا نے یہ کہہ کر بات ٹال دی۔ کہ رات کے کھانے پر بلاؤں گی، ناشتے کے بعد وہ ایک کتاب پڑھنے کا بہانہ کر کے لائبریری میں بند ہو گئی۔ مگر اصل بات یہ تھی کہ وہ پھوپھی کی نظروں سے اوجھل رہنا چاہتی تھی۔ اسے اندیشہ تھا۔ کہ پھوپھی اسے کوئی اور دلگداز داستان سنا کر رلا دیں گی ——

جب ملازم نے اسے بتایا کہ پھوپھی پڑوس کی کسی کوٹھی میں گئی ہیں۔ تو وہ لائبریری سے باہر نکل آئی۔ اور صرف اس لئے کہ ذرا سستی دور کرے کوٹھی کی روش پر گری ہوئی برف صاف کرنے لگی۔ جب روش صاف ہو گئی۔ تو اس نے یہ ٹھانی کہ بڑی سڑک تک جانے والے راستے کو بھی صاف کر ڈالے وہ جلدی جلدی پھاوڑا چلا رہی تھی۔ کہ اتنے میں اچانک ایڈم کی آواز سنائی دی "ہیلو روزا!"

"اوہ" روزا کے ہاتھ سے پھاوڑا چھوٹ کر زمین پر گر پڑا۔ "ایڈم!"

ایڈم کہہ رہا تھا "میں صبح ہی صبح قصبے کے ڈاک خانے اپنی ڈاک وغیرہ وصول کرنے پہنچ گیا تھا۔ وہاں مجھے آپ کے نام کے دو خط بھی دے دیئے گئے یہ ہیں وہ" اور اس نے دو لفافے روزا کی طرف بڑھا دیئے۔

روزا کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں وہ اپنے دل میں بار بار کہہ رہی تھی "یہ ایڈم بن بلائے میری پھوپھی کی کوٹھی پر آ گیا اس میں غرور نام کو نہیں ہے۔ اسے ضرور مجھ سے دلی محبت ہے۔ محبت غرور کو پاس نہیں پھٹکنے دیا کرتی"

دفعتاً اس کی وہ عقل جاگی۔ جس کا پھوپھی نے کل ذکر کیا تھا۔ اس نے

ایڈم سے کہا "آیئے! اندر چلیئے"۔

ایڈم خوش خوش کوٹھی کے اندر چلا گیا۔ وہاں روزا کی پھوپھی موجود تھیں۔ وہ ہمسائی کے ہاں سے ابھی ابھی واپس آئی تھیں ان کے ہاتھ میں گلاب کا ایک بڑا سا پھول تھا۔ جونہی روزا نے ان کا ایڈم سے تعارف کرایا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اور وہ پھول اس کے کالر کے کاج میں اڑس دیا۔ پھر ہنس کر بولیں۔

"یہ ایک جھاڑی کا پھول ہے۔ جو میں نے تحفے کے طور پر پیش کیا مگر روزا میرے خاندان کا پھول ہے۔ اور نفیس ترین پھول۔ یہ تحفہ آپ کو میں نہیں دے سکتی۔ یہ آپ کو خود اپنی کوشش سے حاصل کرنا ہو گا۔ بشرطیکہ آپ اس کے اہل بن کر دکھائیں گے"

ایڈم نے کمر تک جھک کر کہا "میں اس تحفے کا اہل بننے کی کوشش کروں گا"

روزا نے اپنے دل میں کہا "پھوپھی مجھے شادی کے جھمیلے میں پھنسا رہی ہیں۔ اب میں کیا کروں؟ مگر میں کر ہی کیا سکتی ہوں۔ غرور اور جذبۂ آزادی بڑے شاندار الفاظ ہیں۔ مگر ان کی شان الفاظ ہونے کی حد تک ہی ہے۔ اگر ان کا ترجمہ حقیقتوں میں کیا جائے تو ان کا مطلب کیا رہ جاتا ہے۔ سوائے اس کے کہ شادی نہ کر کے ساری زندگی، اداسی، تنہائی اور محرومی کی بھینٹ چڑھا دی جائے"

اس نے فیصلہ کیا۔ کہ وہ پھوپھی کو اپنا کام کرنے دے گی۔ اور خود خاموش رہے گی۔ غرور، خودداری اور جذبۂ آزادی کو پامال کرا دینا چاہیئے۔ تاکہ وہ خود زندگی بھر حالات کی رو تاریں میں آ کر پامال نہ ہوتی رہے۔

پھوپھی کہہ رہی تھیں "اے لڑکی! مسٹر ایڈم سے باتیں چیتیں کر۔ بھئی۔ ایڈم۔ یہ آج رات آپ کو ڈنر پہ مدعو کرنے کی سوچ رہی تھی"

"اچھا!" ایڈم خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ "واقعی؟ میں ضرور آؤں گا۔ پھوپھی آپ"

مگر پھوپھی کمرے سے کھسک چکی تھیں۔ اور وہاں ایڈم کے علاوہ صرف روزا تھی جو حیا کے بوجھ سے دبی جا رہی تھی!

(ایک انگریزی افسانہ)

آسما سلیم

غلط توقعات کبھی قائم نہ کیجیے

آج کل دنیا میں ہر جگہ یہ حالت ہے کہ لوگ غلط توقعات قائم کر لیتے ہیں اور جب ان کے نتیجے ان کی مرضی کے موافق نہیں نکلتے تو حالات کو کوستے ہیں۔ زندگی سے بیزاری ظاہر کرتے ہیں اور دنیا کو برا بھلا کہنے لگتے ہیں۔ گویا غلطی تو ان کی اپنی ہوتی ہے مگر اس کا الزام دنیا کے سر منڈھ دیتے ہیں۔

یہ لوگ غلط توقعات کیوں قائم کرتے ہیں؟ یوں کہ انہوں نے اپنے ذہنوں میں غیر حقیقی معیاروں کے اونچے اونچے محل کھڑے کر رکھے ہوتے ہیں اب جو معیار یہ چاہتے ہیں وہ کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس طرح یہ ایک خیالی دنیا میں زندگی بسر کرتے ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان کے خیالات ان کی تمناؤں اور ان کے سوچنے کے ڈھنگ کا روزمرہ کی عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوا کرتا۔ غرض یہ بذات خود غلط قسم کے انسان ہوتے ہیں چنانچہ جو توقعات قائم کرتے ہیں وہ بھی غلط ہی ہوتی ہیں۔

حال میں میری ایک سہیلی کے شوہر انہیں اور ان کے بچوں کو ساتھ لے کر پُرفضا مقامات کی سیر کرنے گئے تھے۔ انہوں نے مری کی پُرفضا رونق دیکھی، کوئٹے کی سیر کی۔ آزاد کشمیر بھی گئے۔ اور لاہور کے قابل دید تاریخی مقامات شالامار باغ اور مقبرۂ جہانگیر بھی دیکھے۔ جب یہ لوگ واپس پہنچے تو میں ان سے ملنے گئی تاکہ اپنی سہیلی سے ان کی دلچسپ سیاحت کے مزیدار حالات سنوں۔ میرا خیال تو یہ تھا کہ گھنٹے دو گھنٹے ان کی مزیدار باتیں سن کر لطف کے ساتھ وقت گزاروں گی۔ مگر انہوں نے سفر کی تکلیفوں اور دشواریوں کا دکھڑا رونا شروع کر دیا۔ بیچارے صاحب لطف کی جگہ کوفت پلّے پڑ گئی۔

بظاہر ہے کہ میری سہیلی نے اس سیاحت کے دوران میں بڑی دلکشا عمارتیں اور دل فزا منظر دیکھے ہوں گے لیکن ان کی زبان پر ان کا ذکر تو آیا نہیں البتہ سفر کی تکالیف کا دکھڑا آ گیا۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ یہی کہ انہوں نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ سیاحت کرنا ایرکنڈیشنڈ کمرے میں آرام کرسی پر دراز رہنا ہے۔ انہوں نے غلط توقعات قائم کی تھیں عقلمندی کا تقاضا یہ تھا کہ وہ سیاحت سے حاصل ہونے والے لطف کو فوقیت دیتیں اور تکالیف کو چنداں اہمیت نہ دیتیں مگر انہوں نے جو غلط توقعات قائم کر رکھی تھیں ان کی وجہ سے سیاحت کا لطف بھی نہ اٹھایا اور شوہر کی خاصی رقم بھی برباد کر ڈالی۔

اسی طرح شادی کے بارے میں بعض لوگ یہ توقع رکھتے ہیں۔ کہ شادی کر لینے سے مرد عورت دونوں پر جنت کا دروازہ کھل جائے گا حالانکہ شادی ہو جانے کے بعد اسے کامیاب بنانے کے لئے بڑی عقلمندی، سلامت روی، معقولیت، باہمی ایثار اور جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور یہ سب محض خوش آئند توقعات سے بالکل مختلف ہیں۔

شادی کے از خود کامیاب اور بامراد ہو جانے کی توقع چونکہ عملی زندگی سے ناواقفیت کے سبب قائم کی جاتی ہے اس لئے نتیجہ وہی نکلتا ہے جس کی توقع نہیں ہوتی۔ اس سے میاں بیوی دونوں مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کو الزام دینے لگتے ہیں۔

اس قسم کی غلط ذہنیت کی اصلاح کس طرح ممکن ہے؟

(باقی بر صفحہ ۶۵)

صحت و تندرستی

لیڈی ڈاکٹر محمودہ بشیر

دوجیا عورت

کل میری ایک عزیزہ مجھ سے کہنے لگیں: "اب کے مجھے ماہواری نہیں ہوئی اور سگریٹ کے دھوئیں اور کافی کی بُو ناک میں آجائے تو اسی دم متلی ہونے لگتی ہے۔ جب میں نے یہ بات اپنے شوہر سے کہی تو وہ فوراً بولے "معلوم ہوتا ہے پھر امید سے ہو گئی ہو"۔

ماہواری رکنے سے ایک ہفتہ پہلے بہت سی عورتوں کو بعض چیزوں کی بُو ناگوار محسوس ہونے لگتی ہے۔ کیونکہ جسم میں بعض ایسی تبدیلیاں شروع ہو جاتی ہیں جن کی وجہ سے سونگھنے کے آلات کو بُو بری معلوم ہوتی ہے بعض عورتوں کو ناگوار بُو کے بغیر بھی متلی ہوتی ہے۔ اور اکثر و بیشتر صبح کے وقت ہوتی ہے۔ یہ عورتیں حقیقت میں تو علیل نہیں ہوتیں مگر سارے دن خود کو علیل محسوس کرتی رہتی ہیں۔ عموماً حمل ٹھہرنے کے وقت تیسرے مہینے کے اخیر میں یہ شکایات ختم ہو جاتی ہیں۔ مگر چند ایک عورتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو حمل کے دوران میں تمام وقت ان کا شکار رہتی ہیں۔ گو کبھی کبھار ان کی طبیعتیں سنبھل بھی جاتی ہیں۔

جو بات کسی عورت کو اس سے خبردار کرتی ہے کہ وہ امید سے ہے وہ متوقع وقت پر ماہواری نہ ہونا ہے۔ مگر کسی عورت کی ماہواری بند ہونے کا واحد سبب یہ نہیں ہوتا کہ وہ امید سے ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ماہواری خرابی صحت کی وجہ سے بند ہو گئی ہو یا کوئی نفسیاتی پیچیدگی اس میں مانع ہو گزشتہ عالمی جنگ میں گرفتار ہونے والی عورتوں کی ماہواری اسی وقت رک گئی جب وہ اپنے دشمنوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئیں۔ مگر جب رہا کر دی گئیں تو ماہواری بلا تاخیر ہونے لگی۔

بعض حاملہ عورتوں کو اس کا پوری طرح یقین نہیں ہوتا کہ ان کو ماہواری آئی ہے یا نہیں۔ مگر بعض دیگر عورتوں کو امید سے ہونے کی حالت میں تمام وقت ماہواری آتی رہتی ہے۔ اس لئے جب کبھی یہ محسوس ہو کہ حمل ٹھہر گیا ہے تو خواہ ماہواری رک گئی ہو یا آ رہی ہو کسی ڈاکٹرنی کو دکھانا چاہیئے۔ اور اس کی ہدایات کے مطابق احتیاطی تدبیریں شروع کر دینی چاہئیں۔ سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ فوراً محنت طلب کام چھوڑ دینے چاہئیں۔ اور آرام کرنا چاہیئے۔ اگر اس کی طرف توجہ نہ کی جائے گی تو آگے چل کر تکلیف ہو گی۔

امید سے ہونے کی ابتدائی علامت نڈھال پن کی وہ کیفیت ہوا کرتی ہے جو بیشتر حاملہ عورتوں پر بچہ پیٹ میں پڑتے ہی طاری ہو جاتی ہے ان میں سے زیادہ تر عورتیں یہی محسوس کرتی ہیں۔ کہ اب ان سے گھر کی جھاڑو بہاڑو اور بھاگ دوڑ کے کام نہ ہو سکیں گے۔ اسی طرح ان کا جی یہ بھی چاہتا ہے۔ کہ شام پڑے ہی سو جائیں۔ چنانچہ اگر آرام کرسی میں بھی بیٹھی ہوں تو اسی حالت میں سو جاتی ہیں۔

امید سے ہونے کی حالت میں چھاتیوں کی وضع قطع بھی بدلنے لگتی ہے۔ اکثر وہ بھاری ہو جاتی اور نرم پڑ جاتی ہیں مگر ان کے وزن اور نرمی میں اضافہ بتدریج ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ چونکہ چھاتیوں کی جانب خون زیادہ مقدار میں آنے لگتا ہے۔ اس لئے وہ زیادہ گرم بھی رہنے لگتی ہیں اور ان کی جلد کے نیچے نیلی نیلی باریک رگیں بھی دکھائی دینے لگتی ہیں آگے چل کر ان کی گھنڈیوں کے ارد گرد کالی کالی جگہ کا رقبہ بڑھ جاتا ہے۔ اور اس کی رنگت روز بروز زیادہ گہری کالی ہو جاتی ہے۔ مگر ضروری نہیں کہ ہر عورت کی چھاتیوں میں ٹھیک یہی تبدیلی ہو۔ ایک بات یہ بھی دیکھی گئی ہے کہ حاملہ عورت کے

پستان پہلے سے زیادہ حساس ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اگر جاڑے کا موسم ہو تو ان میں سردی لگنے سے درد محسوس ہوتا ہے۔ جس سے خاصی تکلیف ہوتی ہے چھاتیوں کے حساس ہونے کا ایک اور مظاہرہ یوں بھی ہوتا ہے کہ اگر پیٹ کے اندر پلنے والے بچے کا خیال شفقت کے ساتھ کیا جائے یا اپنے کسی اور بچے کی کسی بات پر پیار آئے تو چھاتیوں میں گدگدی سی ہوتی ہے۔ اس گدگدی کا ایک نتیجہ بعض صورتوں میں یہ بھی ہوا کرتا ہے۔ کہ چھاتیوں کے بھٹوں کے غیر ارادی طور پر سکڑنے سے چھاتی سے دودھ کی بھوار چھوٹنے لگتی ہے

امید سے ہونے کے فوراً بعد پیٹ کافی بڑھ جایا کرتا ہے حالانکہ اس وقت بچے کی جسامت ایک گھنڈی وا رین کی گھنڈی سے زیادہ نہیں ہوتی۔ عام طور سے یہی سمجھا جاتا ہے۔ کہ حاملہ کا پیٹ حمل کی وجہ سے بڑھ رہا ہے مگر حقیقت یہ ہوتی ہے کہ حاملہ کو بدہضمی کی شکایت ہوا کرتی ہے۔ جس کی وجہ سے اس کے پیٹ میں ہوا بھر جاتی ہے۔ اور وہ پھول کر معمول سے کہیں زیادہ بڑھ جاتا ہے۔

پیشاب پاخانے کے معاملے میں بھی حاملہ عورت کی حالت دوسری عورتوں سے بہت مختلف ہو جاتی ہے۔ اسے پیشاب کی حاجت بار بار ہوتی ہے۔ اور بہتایک ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ پیشاب نسبتاً زیادہ مقدار میں بھی آتا ہے مگر جہاں تک قضائے حاجت کا تعلق ہے۔ اسے قبض رہنے لگتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہوا کرتا کہ اس کا معدہ خراب ہو گیا ہے۔ بات صرف اتنی ہوتی ہے۔ کہ ہارمونز میں بعض ایسی تبدیلیاں ہونے لگتی ہیں جن کی وجہ سے معدہ سست ہو جاتا ہے۔

جب بچہ پیٹ میں پھرنے لگتا ہے۔ تو حاملہ عورت کا دل خوشی سے باغ باغ ہو جاتا ہے۔ جو عورت پہلی مرتبہ امید سے ہوئی ہو اسے تو یہ معلوم کر کے کہ وہ "دو جیا" ہے۔ حالتِ حمل کی ساری تکلیفیں اور پریشانیاں ہیچ معلوم ہونے لگتی ہیں۔ اس کا دل مسرت سے بے قابو ہو کر رقص کرنے لگتا ہے۔ کہ اب وہ اکیلی نہیں رہے گی۔ اس کے پاس اس کا بچہ بھی ہو گا۔

یہ کتنی عجیب روحانی داستان ہے۔ کہ ایک وجود کے اندر ایک اور ننھا منا وجود زندگی کے سانس لے رہا ہوتا ہے۔ پھر یہ ننھا وجود بڑے وجود کے اندر رہنے کے دوران ہی میں پل کر بڑا ہو جائے گا۔ حالانکہ بڑے وجود کو کچھ معلوم نہیں کہ وہ کون ہے۔

بچے کا پیٹ کے اندر پھرنا شروع شروع میں اس قسم کی ایک ہلکی سی آواز معلوم ہوتا ہے۔ جیسے پیٹ کے نچلے حصے میں بہت آہستہ سے دستک دی جا رہی ہے۔ جن خواتین کو امید سے ہونے کا اتفاق ہو چکا ہے ان میں سے بیشتر اس کی تصدیق کریں گی کہ شروع شروع میں انہیں اس کا پختہ یقین نہیں ہوتا کہ یہ بچے کے پھرنے کی آواز ہے یا ہوا ہے۔

تیسرے مہینے کے اخیر میں حاملہ عورت کو اپنے اندر کوئی چیز واقعی حرکت کرتی معلوم ہونے لگتی ہے۔ اور پھر چند مہینے بعد تو بچہ کبھی اتنے زور سے لاتیں مارتا ہے کہ ماں گھبرا اٹھتی ہے مگر پھر کچھ سوچ کر مسکرانے لگتی ہے اور اس کا چہرہ خوشی کے اثر سے گلابی ہو جاتا ہے۔

جب بچہ بڑا ہوتا ہے تو حاملہ کی جلد پر اس قسم کی شکنیں نمودار ہوتی ہیں جو جلد کے کھنچنے پر دلالت کرتی ہیں۔ مگر ایسی شکنیں صرف حالتِ حمل ہی میں نہیں پڑا کرتیں۔ ہر اس حالت میں جس میں جلد تنتی ہے ایسی ہی لکیریں نمودار ہو جایا کرتی ہیں۔

پانچویں یا چھٹے مہینے پیٹ کے وسط میں ایک شکن پڑنے لگتی ہے جس کا رنگ روز بروز زیادہ گہرا ہوتا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ چھاتیوں کی گھنڈیوں کے گرد کا رقبہ گہرا سیاہ ہو جاتا ہے یہ دونوں علامتیں کم و بیش ہر حاملہ عورت کے جسم پر ظاہر ہوتی ہیں۔

مذکورہ بالا سب علامات میں سے بہت سی علامتیں ایسی عورتوں میں بھی نمودار ہو سکتی ہیں۔ جو امید سے نہ ہوں مگر ان میں سے بعض اس بات کا قطعی ثبوت ہوتی ہیں کہ جس عورت میں نظر آ رہی ہیں وہ امید سے ہے

اگر وہ ڈاکٹرنی، جسے حاملہ کو دکھایا جائے، پیٹ ٹٹول کر بچے کے اعضائے جسم معلوم کرے۔ اور اس کے دل کی دھڑکنیں بھی سن لے تو یہ بات ایک ناقابلِ انکار حقیقت بن جاتی ہے کہ بچہ حاملہ کے جسم کے اندر موجود ہے۔ بعض لوگ ایکسرے کرواتے ہیں اس سے بھی بچے کی ہڈیوں کا پتا چل جاتا ہے۔ اور یہ بھی پیٹ کے اندر اس کی موجودگی کا ایک قطعی ثبوت ہوا کرتا ہے۔ لیکن عام طور سے ایکسرے اس حالت میں کرواتے ہیں جب یہ شبہ ہو کہ پیٹ کے اندر ایک نہیں دو یا تین بچے ہیں۔ مگر جڑواں بچوں کی موجودگی کا پتا ایکسرے کے بغیر بھی چلایا جا سکتا ہے اس کی ترکیب یہ ہے کہ بیک وقت دو ڈاکٹرنیاں حاملہ کے پیٹ کے دو مختلف

(باقی بر ص ۶۷)

لیڈی ڈاکٹر مس راشدہ قریشی

آپ کے سوالات

بچّے کو چُسنی کا عادی بنانا چاہیئے یا نہیں؟

سوال - مہربانی فرما کر اس بارے میں اپنی رائے ظاہر کیجئے کہ آیا بچے کو چُسنی کا عادی بنانا چاہیئے یا نہیں؟ میرا خیال ہمیشہ سے یہی ہے کہ چُسنی غیر صحت مند ہے اور بچے کے مُنہ کے لئے بھی مضر ثابت ہوتی ہے مگر پچھلے ہفتے اپنی بہن کے گھر میں نے یہ دیکھا کہ ان کی بچی، جو چار سال کی ہے رات بھر روتی اور چیختی رہی مگر اگلی صبح جب چُسنی منہ کو لگا دی گئی تو چُپ ہو کر آرام سے سو گئی۔ میرے ہاں اگلے مہینے بچہ ہونے والا ہے اس لئے پہلے سے طے کر لینا چاہتی ہوں کہ اسے چُسنی کا عادی بنانا ہے یا نہیں؟

جواب - چُسنی صحت بخش یا غیر صحت بخش ہونے کا دارو مدار ہر گھر کے مخصوص حالات پر ہوا کرتا ہے۔ اگر چسنی کو مناسب طریقے سے دھویا نہ جائے اور اس کے جراثیم ہلاک نہ کئے جائیں۔ تو یہ بچے کے لئے یقیناً مضر ثابت ہوگی۔ اسی طرح اگر بچے کی عمر تین برس کی ہو جانے کے بعد بھی اس کے منہ سے چسنی الگ نہ کی جائے۔ تو اس کے منہ کے لئے مضر ثابت ہو سکتی ہے۔ دوسری طرف چونکہ بچے کو چوسنے سے راحت محسوس ہوتی ہے۔ اس لئے چُسنی کسی تکلیف کے دوران (جیسے دانت نکلتے ہیں) اسے آرام بھی پہنچا سکتی ہے۔ اگر بچے کو چُسنی دینی ہی ہو تو پھر تین باتوں کا خاص طور سے خیال رکھنا چاہیئے۔

(۱) اسے زیادہ سے زیادہ صاف کیا جائے۔

(۲) اسے شکر، شہد یا فروٹ جوس میں نہیں ڈبونا چاہیئے۔

(۳) اسے بچے کے منہ سے صرف اس حالت میں لگانا چاہیئے جب وہ اور کسی ترکیب سے چپ نہ ہو۔ بعض بچے چُسنی کے بجائے اپنا انگوٹھا چُوسنا پسند کرتے ہیں۔ انہیں ایسا کرنے سے روکنا نہیں چاہیئے

ٹائیفائڈ بخار اور اس کا تدارک

سوال - ٹائیفائڈ بخار کیا ہوتا ہے؟ اس کا تدارک کس طرح کیا جا سکتا ہے؟ آجکل ہماری کالونی میں ٹائیفائڈ کا بڑا زور ہے۔

جواب - یہ بخار ایک شدید قسم کی چھوت کی بیماری ہے۔ جو پانی یا خوراک میں موجود خطرناک جراثیم جسم کے اندر پہنچ جانے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اس کے جراثیم پہلے انتڑیوں میں شدید سوزش پیدا کرتے ہیں۔ پھر وہاں سے پاخانے میں جا ملتے ہیں۔ اگر اس کے بعد پاخانہ ٹھیک طرح نہ ہو تو یہ جراثیم دیگر اعضا کو متاثر کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ٹائیفائڈ بخار کا مریض اچھا ہو جانے کے بعد بھی ان جراثیم کو پاخانے میں خارج کرتا رہتا ہے۔ اس لئے اسے اوروں سے الگ رکھنا چاہیئے اس کے خارج کئے ہوئے جراثیم بغیر دھلے ہاتھوں یا خراب پانی کے ذریعہ تندرست انسانوں کے جسموں میں داخل ہو کر انہیں بیمار کر سکتے ہیں۔ اس بخار سے بچے رہنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ خود کو زیادہ سے زیادہ صاف ستھرا رکھا جائے۔ اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو سال میں ایک مرتبہ خود کو جراثیم سے پاک کرایا جائے۔

ماہواری کی بے قاعدگی

سوال - مجھے چھ مہینے پہلے تک ماہواری باقاعدگی سے آتی تھی مگر اب چھ چھ مہینے بعد آتی ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ میری عمر بائیس برس کی ہے۔

جواب۔ ماہواری کی بے قاعدگی کا سبب کبھی تو ہلکی سی چھوت ہوا کرتا ہے اور کبھی کوئی جذباتی صدمہ۔ اگر آجکل آپ کسی وجہ سے پریشان یا آزردہ رہتی ہوں۔ تو اس حالت پر قابو پائیے۔ مگر اسی کے ساتھ کسی ڈاکٹر سے بھی مشورہ کر لیجئے۔ ممکن ہے ماہواری کے باقاعدہ نہ آنے کی یہ وجہ نہ ہو۔

ٹانگوں کا درد

سوال۔ اکثر رات کو میری ٹانگوں میں درد ہونے لگتا ہے۔ اس کی روک تھام کس طرح کروں؟

جواب۔ ٹانگوں کا درد خون کے دوران میں گڑبڑ، اعصابی کمزوری یا خوراک میں کیلسیم کی کمی کی وجہ سے ہوتا ہے اگر ممکن ہو تو دودھ کا ایک گلاس روزانہ پینا شروع کر دیجئے۔ اس سے آپ کے جسم کو فی الفور کیلسیم ملنے لگے گی۔ اگر یوں درد دور نہ ہو تو پھر اپنے معالج کو دکھائیے۔

پرانی دوائیں تلف کر دیجئے

سوال۔ ہماری دواؤں کی الماری میں بہت سی ایسی دوائیں بکھری ہوئی ہیں جو ہم نے برسوں سے یا تو استعمال ہی نہیں کی ہیں یا تھوڑی تھوڑی استعمال کی ہیں انہیں رہنے دینا چاہیئے یا پھینک دوں؟

جواب۔ بعض دوائیں کچھ عرصے بعد بیکار اور بعض مضر ہو جاتی ہیں اس لئے مناسب یہی ہے کہ آپ دواؤں کے اس پرانے اسٹاک کو تلف کر دیں اس سلسلے میں یہ نکتہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ نہ اپنی دوائیں اوروں کو دیا کیجئے نہ ان سے ایسی دوائیں لیا کیجئے جو کسی اور کے لئے تجویز کی گئی ہوں۔ جو چیز ایک شخص کے لئے سامان زندگی ہوتی ہے وہ دوسرے کے لئے زہر ہلاہل ثابت ہو جایا کرتی

اپنی چھاتی کا دودھ کن حالات میں نہیں پلانا چاہیئے

سوال۔ اپنے بچے کو اپنی چھاتی سے دودھ پلانا کن حالات میں بند کر دینا چاہیئے؟

جواب۔ ان حالات میں کہ چھاتیوں کو چھوت کی بیماری لگی ہوئی ہو یا چھاتیوں کی گھنڈیوں میں درد رہتا ہو یا وہ ڈھلک چکی ہوں یا اندر بیٹھ گئی ہوں۔ اسی طرح جب ماں تپ دق میں مبتلا ہو تو اسے اپنے بچے کو اپنی چھاتی سے دودھ ہرگز نہیں پلانا چاہیئے جن ماؤں کی چھاتیوں میں دودھ نہ اترتا ہو۔ انہیں بھی اپنے بچوں کو اپنی چھاتی کا دودھ نہیں دینا چاہیئے۔

پائیوریا کی دوا

سوال۔ کیا کوئی ایسی دوا ہے جس سے پائیوریا اچھا ہو جائے؟

جواب۔ بعض ماہر دندان سازوں نے پائیوریا کیلئے یہ دوا تجویز کی ہے کھانے کا نمک اور سوڈا بائیکاربونیٹ برابر برابر کی مقدار میں لے کر محلول بنا لیا جائے۔ اور اسے دانتوں کے برش کے ذریعے استعمال کیا جائے مگر حقیقت یہی ہے۔ کہ اس موذی مرض کی کوئی دوا نہیں

سوال۔ میرے بچے کو جس کی عمر چھ سال کی ہے پچھلے ایک ماہ سے آنکھیں کچھ اس طرح جھپکانے کی عادت پڑ گئی کہ اس کی یہ حرکت بڑی دہشتناک معلوم ہوتی ہے۔ وہ نروس سا رہتا ہے۔ بات بات پر الجھ پڑتا ہے اور ہر کام میں متعدی دکھاتا ہے۔ ہمارے خاندانی معالج نے یہ رائے ظاہر کی ہے اس کی یہ قابل اعتراض حرکت کسی اعصابی خرابی کا نتیجہ ہے۔ اس لئے ہمیں اس بات سے پریشان نہیں ہونا چاہیئے۔ اس نے یہ تجویز کیا ہے کہ ہم اپنے بچے کو کسی ماہر چشم کو دکھائیں اور اس سے کہیں کہ وہ بچے کا خصوصی طبی معائنہ کرے کیا ہم اس مسئلے کے حل کے معاملے میں صحیح راستے پر جا رہے ہیں؟ بچوں کی آنکھوں میں اس قسم کی خرابی کی وجوہ کیا ہوتی ہیں؟

جواب۔ آپ کے خاندانی معالج کا مشورہ بہت مناسب ہے بچے کا جلد از جلد طبی معائنہ کرائیے۔ اس سے معلوم ہو جائے گا کہ یہ خرابی آنکھوں سے تعلق رکھتی ہے یا اعصاب سے۔ اکثر اس قسم کی اعصابی خرابیاں اسکول کے ناقابل برداشت حالات یا گھر کی حد سے زیادہ محرک فضا سے بھی پیدا ہو جایا کرتی ہیں آپ اپنے بچے کو ایسے حالات میں پڑنے سے بچائے رکھیں جن میں کشیدگی پریشانی اور عدم تحفظ کا احساس پیدا ہو سکتا ہو اسے خوب سونے دیجئے۔ اور کہہ کہہ کر آرام کرائیے۔ اگر اس کی آنکھ جھپکانے کی عادت کچھ عرصے میں خود بخود غائب نہ ہو تو پھر کسی ایسے ڈاکٹر کو دکھائیے جو بچوں کی جذباتی گڑبڑ سے پیدا ہونے والی بیماریوں کا ماہر خصوصی ہو۔

مہر النساء

خوبصورت بننے کے نئے طریقے

اگر آپ کے خیال میں حُسن کی افزائش کا بنیادی اصول یہ ہونا چاہیئے کہ صرف اپنی ان خوبیوں کو آرائش کے سازوسامان نیز ترکیبوں کی مدد سے اجاگر کیا جائے جو دوسروں کے لئے باعث کشش بن سکتی ہیں۔ تو آپ غلطی پر ہیں۔ حسن کی افزائش ایک اور طریقے سے بھی ہو سکتی ہے۔ جو آپ کے اس اصول سے بالکل مختلف ہے۔ گو اپنی جگہ پر صد فی صد درست ہے اور وہ طریقہ یہ ہے۔ کہ آپ کے بالوں، سر، ماتھے، آنکھوں، ناک، دہانے، دانتوں، گردن، سینے، کمر، ہاتھوں، شکم، ٹانگوں اور پاؤں میں اگر کوئی عیب یا نقص ہو تو افزائش حُسن کے سازوسامان اور مختلف ترکیبوں سے اس عیب کو چھپا لیجئے۔ آپ پہلے سے زیادہ حسین جاذب نظر اور دیدہ زیب نظر آنے لگیں گی۔

اس اصول کی بنیاد علم نظر کے اس قاعدے پر ہے کہ انسانی آنکھ صرف اتنا دیکھتی ہے جتنا ذہن کے پردے پر مرتسم ہو جائے۔ اور پیش نظر صورت کی تمام جزئیات کو بغور نہیں دیکھتی۔ گویا لوگ کسی چیز کے ایک حصے کو دیکھ کر بقیہ کے بارے میں صرف تصور کے بل پر فیصلہ کر لیتے ہیں اور اس سلسلے میں بغور مشاہدے کی زحمت نہیں اٹھاتے۔

اس سے یہ نتیجہ نکلا۔ کہ اگر آپ اپنے جسم کے عیبوں کو چھپا لیں تو، دیکھنے والوں کی نظریں آپ کی خوبیوں پر آن جمیں گی۔ اور وہ یہ سمجھ لیں گے کہ آپ حسین ہیں۔ اور یہ کام افزائش حسن کے اس سازوسامان سے بآسانی انجام دیا جا سکتا ہے۔ جو آپ روزمرہ استعمال کرتی رہتی ہیں۔

شاید آپ میں سے بعض خواتین نادانستہ یہی کر بھی رہی ہوں لیکن اگر آپ اس افزائش حسن کے بنیادی اصول پر سوچ سمجھ کر عمل کرنے لگیں اور اس اصول کو برتنے کے مختلف طریقوں سے بھی واقف ہو جائیں تو اس صورت میں آپ نہ صرف پہلے سے زیادہ حسین نظر آنے لگیں گی بلکہ شاید اپنی صورت شکل کو بالکل بدل ڈالنے میں بھی زیادہ سے زیادہ کامیابی حاصل کر لیں۔ اب یہ نئے طریقے سنئے۔

شاید آپ یہ سمجھتی ہوں کہ آپ کے دُبلے پتلے ہونے کی وجہ سے آپ کی خوبصورتی میں فرق آ رہا ہے اور اگر آپ ذرا "فربہ" ہوتیں تو زیادہ اچھی معلوم ہوتیں۔ اکثر عورتوں کو یہ شبہ ہر وقت بے چین رکھتا ہے اگر آپ بھی اس شش و پنج میں مبتلا ہیں تو اسے ختم کرنے کی ترکیب یہ ہے۔ کہ کافی موٹے کپڑے کا لباس پہنا کیجئے۔ ایک اور ترکیب یہ بھی ہے۔ کہ چیک یا دھاری دار کپڑوں کے لباس پہننے شروع کر دیجئے۔ اس طرح آپ فربہ نظر آنے لگیں گی۔ اور دیکھنے والے آپ کو دُبلا سمجھنا چھوڑ دیں گے۔ اس کے برعکس اگر کسی خاتون کو دُبلی پتلی نظر آنے کا شوق ہو تو وہ بہت باریک کپڑے کا لباس پہنا کریں اور چیک یا دھاری دار لباس کبھی نہ پہنیں۔ وہ دبلی بھی معلوم ہونے لگیں گی اور لمبی بھی!

اگر ناک نقشے میں فرق پیدا کرنا ہو تو یہ کام میک اپ کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ اگر آپ یہ چاہتی ہیں کہ آپ کا چہرہ چوڑا نظر آئے تو اس کی ایک سیدھی سی ترکیب یہ ہے کہ بال پیچھے کی طرف ڈالا کیجئے۔ اور چوٹی خوب کس کر باندھا کیجئے۔ اس طرح آپ کا ماتھا بڑا نظر آئے گا۔ اس سے چہرہ بڑا بھی معلوم ہو گا اور چوڑا بھی نظر آئے گا۔ لیکن اگر اس کے برعکس آپ کو یہ منظور ہو کہ آپ کا چہرہ چھوٹا دکھائی دے تو بالوں کو ماتھے پر جھکائے رہیئے

بال ہمیشہ اس طرح بنایا کیجئے۔ کہ آپ کی خوبصورتی اجاگر ہو اور

آپ کے چہرے کے عیبوں یا نقائص کی پردہ پوشی ہوتی ہے۔ اس سے حُسن بڑھے گا۔ چنانچہ جن خواتین کے ماتھے زیادہ اونچے ہیں۔ انہیں اپنے ماتھوں پر بالوں کی جھالریں لٹکانی چاہئیں۔ اگر ماتھا تنگ ہو لیکن بالوں کی جھالر اچھی لگتی ہو تو اس صورت میں بھی جھالر لٹکائی جا سکتی ہے مگر یہ بہت چھوٹی ہونی چاہیئے یعنی اس سے ماتھے کا زیادہ حصّہ نہ ڈھکے اگر آپ کے لئے آپ کی پیشانی ایک مسئلہ بنی ہوئی ہو تو اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے یہ لٹکا ایک آسان ترین طریقہ ثابت ہوگا۔

اگر آپ کی گردن چھوٹی ہو تو سر اٹھا کر اس طرح چلا کیجئے جیسے آپ کو اپنے اوپر بڑا فخر ہے۔ کانوں کے بُندے ایسے کبھی نہ پہنیئے جو لمبے لمبے ہوں۔ ان کا لٹکتے ہیں ادھر اُدھر ہلنا بہت بُرا معلوم ہوگا۔ مختصر سے بُندے آپ کی چھوٹی گردن کے ساتھ زیادہ متناسب ہیں گے۔

چھوٹی گردن کی خواتین کو لمبے بال بھی اچھے نہیں لگتے۔ بعض خواتین جو مشرقی مزاج رکھتی ہوں گی۔ اپنے لمبے لمبے بالوں کو ترشوانے پر کسی حالت میں آمادہ نہ ہوں گی۔ تاہم یہ واقعہ ہے کہ بال چھوٹے کروا لئے جائیں تو گردن لمبی دکھائی دینے لگتی ہے۔ بلکہ بعض خواتین کی گردنیں بالوں کے اس سٹائل سے صراحی دار یا لمبوتری گردنیں بھی معلوم ہونے لگیں گی۔

اس کے برعکس اگر آپ کو یہ شکایت ہو کہ آپ کی گردن لمبی ہونے کی وجہ سے بُری معلوم ہوتی ہے۔ تو کانوں کی لوکوں کی سطح سے نیچے بالوں کے گچھے رکھیئے۔ ان سے لمبی گردن چھوٹی نظر آنے لگتی ہے

اگر کندھے چھوٹے ہوں تو آدمی مریل سا معلوم ہوتا ہے اور کسی عورت کا مریل نظر آنا بدترین خرابی ہے۔ لیکن اگر کمر پر کوئی پیٹی یا بیلٹ خوب کس کر باندھ لی جائے تو کندھے چوڑے معلوم ہونے لگتے ہیں۔

بعض خواتین کو یہ بات ہر وقت کھٹکتی رہتی ہے کہ ان کی ناک ضرورت سے زیادہ لمبی ہے۔ اس میں تو شک نہیں کہ لمبی ناک سے چہرے کی خوبصورتی میں فرق پڑتا ہے۔ لیکن اس عیب کو بڑی آسانی سے دُور بھی کیا جا سکتا ہے۔ سر کے بال اوپر سے سیدھے اتار دیئے۔ مگر کانوں کے قریب لا کر ان میں چھلے بنا لیجئے۔ اس ترکیب سے چہرہ چوڑا معلوم ہونے لگتا ہے۔ چنانچہ ناک چھوٹی نظر آنے لگتی ہے۔ لیکن اس سلسلے میں ایک بات کی احتیاط کرنی چاہیئے ماتھے پر چھلے نہ ہوں۔ اسی طرح کنپٹیوں پر بھی نہ بالوں کے چھلے ہوں نہ گھونگھر ڈالے جائیں۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو سارا چہرہ بھدا نظر آنے لگے گا۔

اس کے برعکس اگر ناک چھوٹی یا پھیلی یعنی دبی ہوئی ہو تو سر کے بال گُدّی پر ہی رہنے چاہئیں۔ انہیں کنپٹیوں پر ہرگز نہیں لانا چاہیئے۔ بعض لڑکیاں نئے فیشن کی پیروی میں برش کے بالوں کی طرح کے بال کٹوانے لگی ہیں جن کے سر سے کسی قدر خمیدہ ہوتے ہیں اس قسم کے بالوں سے بھی ناک چھوٹی ہونے کا عیب چھپ جاتا ہے۔ مگر شاید اکثر خواتین اس طرح کے بال نہ کٹوائیں۔

اگر گالوں کے ہاڑے ایک دوسرے سے بہت قریب ہوں۔ تو کانوں کو بالوں سے ڈھکنا چاہیئے اس سے چہرہ کے ہاڑے چوڑے نہ ہونے کے باوجود چوڑا نظر آنے لگتا ہے۔ لیکن بال ضرورت سے زیادہ نہ منڈھے جائیں ورنہ چہرہ بدنما ہو جائے گا۔

کھوپڑی کے اوپر بال اس طرح نہیں بنانے چاہئیں جیسے کوئی ہموار چبوترا بنایا جاتا ہے۔ اس سے چہرہ بہت بھدّا معلوم ہوتا ہے۔ یہ بال بناتے وقت کوشش کرنی چاہیئے کہ ان میں تھوڑا سا ابھار ضرور رہے چبوترے جیسے ہموار بالوں سے گالوں کے ہاڑوں کی خوبصورتی میں فرق آ جاتا ہے۔

اگر گالوں کے ہاڑے اتنے چوڑے نہ ہوں کہ وہ بدنما معلوم ہوتے ہوں۔ تو کنپٹیوں اور ماتھے پر بالوں کے گچھے بنانے سے ان کی بدنمائی دور ہو جاتی ہے۔ مگر گچھے بنانے کیلئے بالوں میں کسے ہوئے چھلے ہرگز نہیں ڈالنے چاہئیں۔

اگر آپ کے چہرے کی رنگت دلکش نہ ہو یا آپ کی آنکھوں کے نیچے حلقے ہوں یا دہن کے گرد بدنما شکنیں ہوں یا آپ کے چہرے میں کوئی اور عیب ہو تو اسے اپنی اس قسم کی حرکات اور انداز سے دور کیجئے جو دیکھنے والوں کی توجہ اس عیب کی طرف سے ہٹا لے۔ مثلاً ہر وقت مسکراتی رہیئے۔ اگر آپ کے دانت خوشنما ہوں تو آپ کی مسلسل مسکراہٹ مندرجہ بالا عیبوں کی طرف لوگوں کی نظریں پہنچنے ہی نہ دے گی مسکرانے کے علاوہ ہاتھوں کی حرکتوں سے بھی یہی کام لیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ خوشنما ہوں

(باقی بر صــ)

نزھت اقبال۔ لنڈن

حیرت انگیز اور دلچسپ



بچوں کا خون چوسنے والی پُراسرار

بچوں کا خون پینے والی پُراسرار لڑکی

عام طور سے یہ سمجھا جاتا رہا ہے کہ ویمپائر (لڑکیوں اور عورتوں کا خون پینے والی بد روحوں) کی ہولناک داستانیں انسانی تخیل کی کارفرمائیاں ہیں۔ لیکن حال ہی میں برازیل میں (MANAOS) مناؤس کے مقام پر ایک عورت کے بارے میں پولیس کو یہ بتایا گیا کہ وہ ویمپائر ہے۔ اور اپنے تیز نوکیلے دانتوں سے بچوں کی گردنوں میں زخم کر کے ان کا خون چوس لیتی ہے۔ یہ لڑکی ساحل سمندر کے قریب پھرتی دیکھی گئی تھی۔ اس کی ٹانگوں پر کالے رنگ کی لمبی جرابیں تھیں اور جسم پر منی اسکرٹ تھی۔ وہ جدید فیشن کی اور لڑکیوں جیسی ایک لڑکی ہی معلوم ہوتی تھی۔ مگر مقامی لوگوں نے اسے ویمپائر بتانا شروع کر دیا۔ اس پر پولیس نے اس لڑکی کو گرفتار کرنا چاہا۔ مگر وہ نہ جانے کہاں غائب ہو گئی کہ کچھ پتا ہی نہ چلا۔ ڈاکٹروں نے زخمی بچوں کی گردنوں کا معائنہ کرنے کے بعد بتایا کہ یہ چمگادڑ کے کاٹے کے نشان ہیں۔

عورت کو پسینے پسینے ہونے کی تنخواہ

ایک عورت اس کام کی تنخواہ پاتی ہے کہ گھنٹوں تک پسینے پسینے ہوتی رہے۔ وہ انگلستان کے مشہور صنعتی شہر مانچسٹر میں پارچہ بافی کے ایک کارخانے میں ملازم ہے۔ جب اس کارخانے میں کوئی نیا کپڑا تیار ہوتا ہے تو وہ کپڑا اس عورت کے جسم پر لپیٹ کر عورت کو ایک کمرے میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ جس کا درجۂ حرارت ایک سو پندرہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے اس عورت کو خوب پسینہ آتا ہے کارخانے کے ماہر اس دوران میں یہ اندازہ کر لیتے ہیں کہ ان کے کارخانے کے نئے کپڑے پر انسانی پسینے کا کیا اثر ہوتا ہے۔

سونے کی ملازمت

امریکہ میں ایک کارخانہ ایسا ہے جس میں صرف پاجامے تیار کیے جاتے ہیں۔ اس کارخانے کی یہ خصوصیت بھی ایک دلچسپ بات ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ تحیّر انگیز بات یہ ہے۔ کہ اس کارخانے میں ایک لڑکی اس کام پر ملازم ہے۔ کہ جب کہا جائے "سو جاؤ" تو اسے فوراً نیند آ جائے۔ کتنی عجیب بات ہے۔ کہ اگر کوئی انسان ڈیوٹی پر ہونے کی حالت میں سو جائے تو اسے سخت سست کہا جاتا ہے یا نکما سمجھ کر ملازمت سے الگ کر دیا جاتا ہے۔ لیکن اس عورت کا کام ہی سونا ہے۔ اسے فوراً سو جانے کا حکم اس وقت دیا جاتا ہے۔ جب کارخانہ کوئی نیا پاجامہ تیار کرتا ہے اور اس کے منتظموں کو یہ معلوم کرنا ہوتا ہے۔ کہ اگر کوئی یہ پاجامہ پہن کر سوئے تو اسے آرام کی نیند آتی ہے یا وہ سوتے میں بے چین رہتا ہے۔ دفتر کے ایک کمرے میں ایک آرام دہ مسہری بچھی ہوئی ہے اس عورت کو نیا تیار شدہ پاجامہ پہنا کر اس میں لٹانے کے بعد فوراً سو جانے کی ہدایت کی جاتی ہے۔ اور پھر اس کے سونے کے دوران میں اس پاجامے کے آرام دہ یا اس کے برعکس ہونے کا اندازہ کیا جاتا ہے۔

لکڑی کی طشتریوں میں کھانا

یوبیریا (جنوبی یورپ) میں ایک عورت رہتی ہے۔ جسے لوہے اور ٹین سے اس قدر شدید نفرت ہے۔ کہ وہ سوئیاں، کیلیں بلکہ لوہے یا ٹین تک اپنے گھر میں نہیں رکھتی۔ اس کے ہاں کھانا پیتل کے برتنوں میں پکتا ہے اور لکڑی کی طشتریوں میں کھایا جاتا ہے۔

دردِ سر کیلئے ناخنوں کا سفوف

چین میں انقلاب سے پہلے دردِ سر دور کرنے کے لئے جو سفوف استعمال کرایا جاتا تھا وہ انسانی ناخنوں کو پیس کر بنایا جاتا تھا۔ یہ ناخن اس طرح فراہم کئے جاتے تھے۔ کہ ہزاروں چینی اس کے سوا اور کوئی کام ہی نہیں کرتے تھے۔ کہ ہر وقت اپنے پاؤں اور ہاتھوں کے ناخن بڑھاتے رہتے تھے۔ جب یہ ناخن کئی انچ لمبے ہو جاتے تھے تو دردِ سر کی دوا تیار کرنے والے ناخنوں کے مالکوں کو معاوضہ دے کر انہیں کاٹ لے جاتے تھے۔

غم زدوں کے دکھڑے سننے کا پیشہ

امریکہ میں روپیہ کمانے کے جہاں اور سینکڑوں، عجیب وغریب طریقے ہیں وہیں ایک ذریعہ آمدنی غم زدہ مردوں اور عورتوں کے دکھڑے سننے کا پیشہ بھی ہے۔ پیشہ ور سننے والے دکھ درد بیان کرنے والوں سے فی نشست چار گنی اجرت لے کر ان کے دکھڑے ایسی توجہ اور ہمدردی سے سنتے ہیں۔ کہ سنانے والوں کو قرار سا آجاتا ہے ان پیشہ ور سننے والوں کی سالانہ آمدنی چھ ہزار ڈالر سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ انہوں نے بڑے شاندار دفتر بنا رکھے ہیں۔ جنہیں خوب آراستہ کر رکھا ہے۔ غم زدہ مرد عورت ان دفتروں میں جاتے ہیں اور فی نشست اجرت ادا کر کے اپنا دکھڑا سنا آتے ہیں۔ سننے والے نہ تو اپنے گاہکوں کا نفسی علاج کرتے ہیں۔ نہ ان کو صلاح مشورہ دیتے ہیں۔ وہ صرف بیٹھے سنتے رہتے ہیں۔ صرف اسی سے غم زدہ مردوں اور عورتوں کے دل پُرسکون ہو جاتے ہیں۔

تتلیاں برآمد کر کے دولت کمایئے

یہ بات یقیناً حیرت سے سُنی جائے گی کہ تتلیاں بھی مالِ تجارت ہیں اور انہیں فروخت کر کے دولت کمائی جا سکتی ہے۔ انگلستان کے علاقے کینٹ کے ایک شہر اولڈ بکسلے میں ایک شخص یُونیو مین یہی کاروبار کرتا ہے وہ ہزاروں کی تعداد میں تتلیاں پالتا ہے۔ اور انہیں دنیا کے تمام ملکوں میں فروخت کرتا ہے۔

کرائے کا ہنسنے والا

امریکہ کے ایک تھیٹر میں ایک شخص صرف ہنسنے کے کام پر ملازم ہے۔ مگر اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ وہ مسخرے کا پارٹ کرتا ہے۔ وہ اسٹیج پر ہنس ہنس کر اوروں کو ہنساتا ہے۔ یہ شخص اسٹیج پر تو کبھی نمودار ہی نہیں ہوتا۔ یہ تو تماشا دیکھنے والوں کے درمیان میں بیٹھتا ہے۔ اور تماشے کے دوران ہر اس موقعے پر ہنسنے لگتا ہے جس پر ہنسنے کی ہدایت کی گئی ہوتی ہے۔ اس کھیل کا مسودہ ان مقامات پر نشان لگا کر اسے دیدیا جاتا ہے جن پر اسے ہنسنا ہوتا ہے۔ اور وہ اس کی مدد سے اپنا کام کرتا رہتا ہے

کتّوں کی طرح بھونکنے کا فن

ڈنمارک کے ایک ماہر صوتیات نے کتوں کی طرح بھونکنے کو ایک فن بنا لیا تھا اور وہ اسی کے ذریعے روزی پیدا کیا کرتا تھا اس کے آبائی شہر کی انتظامی کونسل نے جب اس کے فن کا مظاہرہ دیکھا تو اس کے ارکان نے ماہر صوتیات سے ایک کام لینے کا فیصلہ کیا انہوں نے اس کو اپنے دفتر میں طلب کیا۔ اور اسے یہ پیشکش کی۔ کہ وہ روزانہ صبح سویرے شہر کی گلیوں میں گھومنے نکل جایا کرے اور ہر مکان کے دروازے کے آگے بھونکا کرے اگر یہ پیش کش اسے منظور ہو تو جب تک اس سے یہ کام لیا جائے گا اس وقت تک معقول معاوضہ دیا جائے گا۔ ماہر صوتیات نے یہ عجیب وغریب پیشکش قبول تو کر لی مگر ساتھ ہی یہ بھی معلوم کرنا چاہا کہ آخر اس مہم کا مقصد کیا ہے۔ کونسل کے ارکان نے اسے بتایا کہ اس شہر میں کتوں کے کھانے کی چیزیں تو وافر مقدار میں فروخت ہو رہی ہیں مگر کتوں کے لائسنسوں کی تعداد بہت کم ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں نے کتے تو کافی تعداد میں پال رکھے ہیں۔ لیکن ان کا لائسنس نہ لیکر حکومت کے خزانے کو نقصان پہنچا رہے ہیں جب تم کسی ایسے مکان کے دروازے کے آگے کُتے کی طرح بھونکو گے جس میں کتا ہو گا تو تمہارے بھونکنے کے جواب میں وہ کُتا بھی ضرور بھونکے گا ہم تم کو ایک نوٹ بک اور قلم دیں گے جس گھر میں سے کُتے کے بھونکنے کی آواز آئے گی تم اس کا نمبر نوٹ بک میں درج کر لینا اس کے بعد اگر اس مکان کے مالک نے اپنے کُتے کا لائسنس نہ لیا ہو گا تو ہم اس کے خلاف قانونی کارروائی کریں گے ــ یہ مہم اس قدر کامیاب ثابت ہوئی کہ چھ ماہ کے اندر اندر ہزاروں روپے کتوں کے لائسنس کے وصول ہوئے مگر اس کے بعد ماہر صوتیات بیکار ہو گیا۔ کیونکہ شہر کے باشندے اس کے خلاف ہو گئے اور انہوں نے اس کا بھونکنا سننے کیلئے اسے تقریبات میں بلانا ترک کر دیا ٭

عائشہ میمن

گھریلو کاموں کی منصوبہ بندی

میری ایک سہیلی ہیں جن میں اور خوبیاں تو بے شمار ہیں مگر ایک عیب اتنا زبردست ہے کہ اس کی وجہ سے ان کی خانہ دار زندگی ان کے لئے وبال جان بنی ہوئی ہے۔ وہ عیب یہ ہے کہ طبیعت میں لاأبالی پن ہونے کی وجہ سے یہ صاحبہ گھر کا کوئی کام کسی نظم، ترتیب اور قاعدے سے نہیں کرتیں۔ چنانچہ ان کے ہاں ہر کام پہلے سے سوچے بغیر شروع ہو جاتا ہے اور پھر سے کسی ڈھنگ یا قاعدے سے چلانے کے بجائے الل ٹپ چلایا جاتا ہے۔ اس کے لئے نہ کوئی منصوبہ بنایا جاتا ہے نہ اس کا کوئی طریقہ سوچا جاتا ہے۔ اور نہ یہ فکر ہوتی ہے کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ مجھے ان صاحبہ سے قریبی تعلق ہونے کی وجہ سے ان کے گھر کی ابتری دیکھ کر بڑا قلق ہوتا ہے۔ اور جب کبھی انہیں کوئی کام بگڑنے کی وجہ سے پریشانی اٹھانی پڑتی ہے تو میرے دل کو بھی اتنی ہی تکلیف اور رنج ہوتا ہے جتنا خود انہیں ہوتا ہے۔

اس بنا پر میں کافی عرصے سے سوچتی آ رہی تھی کہ کسی طرح ان کی اس مصیبت کا خاتمہ کیا جائے۔ آخر مجھے یہ سوجھی کہ ان صاحبہ کو منصوبہ بندی کرنی چاہیئے اور پھر کئی دن تک غور و خوض کرتے رہنے کے بعد میں نے ان کے لئے ایک نقشہ عمل بنایا۔

مگر آپ کو معلوم ہے انہوں نے میری اس تمام ذہنی کاوش کی داد کس طرح دی۔ لیجئے میں آپ کو بتاؤں۔ جب میں نے ان سے کہا کہ آپ کو اپنے سب گھریلو کام منصوبہ بندی کے تحت کرنے چاہئیں تو وہ بے اختیار قہقہے مار مار کر ہنسنے لگیں۔ میں نے ان سے اس طرح بے تحاشا ہنسنے کی وجہ پوچھی۔ تو بولیں "منصوبہ بندی بڑے بڑے کاموں کے لئے کی جاتی ہے۔ اور حکومتیں بڑے بڑے ادارے اور صاحبِ ثروت کمپنیاں کیا کرتی ہیں۔ بھلا میں کیا منصوبہ بندی کروں گی۔ کیا پدّی کیا پدّی کا شوربہ اور منصوبہ بندی کروں کہاں۔ چھوٹے گھر میں؟ جس کی کل کائنات ہے ایک میرے میاں صاحب، ایک میں عاجزہ بندی اور دو چھوٹے بچے"۔

میں نے ان کی زبان سے مسخرے پن کا یہ جواب سنا تو دل میں افسوس کرتے ہوئے ان سے کہا کہ "منصوبہ بندی سے وقت، روپیہ اور قوت کی بچت ہوتی ہے"۔ وہ اب کے اور بھی زور سے ہنسیں اور جب میں نے ہنسی اور قہقہوں کا یہ طوفان پھٹنے کی وجہ دریافت کی تو کہنے لگیں کہ بہن آپ باتیں ہی ایسی کر رہی ہیں کہ ان پر اپنے زوروں کی ہنسی آ جاتی ہے بھلا میں جو ایک پاکستانی خانہ دار عورت ہوں وقت روپیہ اور قوت بچا کر کروں گی کیا۔ جہاں تک وقت کا تعلق ہے وہ تو میرے پاس پہلے ہی ڈھیروں بچ جاتا ہے چنانچہ میں اسے جمعدارنی دھوبن، پڑوسنوں اور سودے والیوں سے باتیں کر کے خرچ کرتی ہوں رہا روپیہ، وہ آتا ہی ہے لگا بندھا اور سارے کا سارا اٹھ جاتا ہے بھلا اس کی بچت کس طرح ہو سکے گی۔ اور قوت کی پوچھو تو یہ ہے۔ کہ آجکل کھانے پینے کی ہر چیز میں ملاوٹ کی جا رہی ہے۔ اس سے قوت پیدا ہی کہاں ہوتی ہے۔ بچانے کا سوال تو وہاں پیدا ہو جہاں ایک چیز ہوتی ہو۔ یہاں قوت ہے ہی نہیں۔ بچت کیسے ہو گی؟

میں نے ان سے کہا۔ کیوں محترمہ اگر کوئی غیر متوقع صورت حال پیش آ جائے یا کوئی فوری ضرورت پڑ جائے اور آپ اس کو پورا

نہ کر سکیں تو اس وقت کف افسوس مل مل کر یہ کہتی ہیں نہیں کہ اگر پہلے سے کوئی انتظام کیا ہوتا تو اس وقت یوں پریشانی نہ اٹھانی پڑتی۔ بس اسی انتظام کو منصوبہ بندی کہتے ہیں۔

میری سہیلی کہنے لگیں: "مگر ایسی منصوبہ بندی کوئی خانہ دار عورت گھر کے روزمرہ کے کاموں کے لئے کس طرح کر سکتی ہے! میری سمجھ میں تو یہ بات آتی نہیں کہ گھر کے روز روز کے کام بھی منصوبہ بندی سے کئے جائیں۔ اتنے سارے کام کسی ایک منصوبے کے تحت آپ کیسے کر سکیں گے؟"

میں نے ان سے کہا: "آپ کا یہ خیال غلط ہے۔ کیا آپ روز صبح اٹھتے ہی یہ نہیں سوچتیں کہ آج کیا پکایا جائے گا یا ایسا کونسا کام ادھورا پڑا ہے جسے آج مکمل کر دینا ہے؟"

میں نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے اپنی سہیلی سے مزید کہا۔ کہ اس طرح آپ یہ سمجھے بغیر کہ گھر کے کام منصوبہ بندی سے کر رہی ہیں اصل میں ایک دھندلی یا بے قاعدہ سی منصوبہ بندی ہی کرتی ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو اگر آپ زیادہ منظم طریقے سے کافی غور و فکر کے بعد گھر کے سارے کام ایک پختہ یعنی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کرنے لگیں۔

میری سہیلی کچھ دیر تک سوچتی رہیں پھر کہنے لگیں۔ "اگر آپ منصوبہ بندی کا طریقہ اختیار کرنے پر اتنا زور دے رہی ہیں۔ تو یقیناً آپ تو اپنے گھر کے سارے کام منصوبہ بندی سے کرتی ہوں گی یا ضرور کوئی طریقہ سوچ کر آئی ہیں۔"

میں نے ان کو بتایا کہ میں ان کے گھر کی ابتری سے کافی عرصے سے پریشان ہوں۔ اور اس مسئلے پہ غور کرتی رہی ہوں کہ اس ابتری کا تدارک کیسے ہو۔ چنانچہ میں نے اپنے ذہن میں ایک نقشۂ عمل تیار کر رکھا ہے۔ وہی آپ کو بتا دیتی ہوں۔ میری سہیلی وہ نقشہ معلوم کرنے کیلئے بیتاب ہو گئیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ پہلے گھر کے سب کاموں کی ایک فہرست بنائیے۔ اس کے بعد ان کو چار مدوں میں بانٹ دیجئے

(۱) روزمرہ کے کام جیسے جھاڑو۔ صفائی ستھرائی، کھانا پکانا اور کپڑے دھونا۔ (۲) ہفتہ واری کام جیسے پلنگوں کی چادریں تبدیل کرنا۔ میلے کپڑے دھلنے کیلئے دینا۔ اور الماریوں کی چیزوں کی دیکھ بھال اور صفائی (۳) ماہانہ کام جیسے پردے تبدیل کرنا۔ کپڑوں کی الماری کو صاف کرنا۔ کھڑکیوں اور دروازوں کے شیشوں کو دھونا دھلانا۔ گلدانوں اور دیگر سامانِ آرائش کو چمکانا، حسابات کی جانچ پڑتال کرنا ماہانہ بل ادا کرنا۔ کچن کی صفائی وغیرہ اور (۴) سالانہ کام جیسے فرنیچر پر پالش لگانا۔ پرانی اور بیکار چیزوں کو باہر پھینکنا۔ پرانے کاغذوں کپڑوں اور جوتوں کو ردی کرنا وغیرہ وغیرہ

روزمرہ کے کاموں کا ایک نظام اوقات اس طرح بنانا چاہیئے کہ کونسا کام سب سے پہلے کیا جائے گا اس کے بعد کونسا کام کرنا ہو گا۔ اسی ترتیب سے اور سب کاموں کا بھی وقت مقرر کیا جا سکتا ہے ہفت روزہ کاموں کا بھی ایک نقشہ مرتب کر لینا چاہیئے۔ اس سے یہ کام سات دنوں پر پھیل جائیں گے۔ اور ہر روز کوئی نہ کوئی کام انجام پاتا رہے گا۔ یہی طریقہ ماہوار اور سالانہ کاموں کے سلسلے میں بھی اختیار کیا جا سکتا ہے

منصوبہ بندی کرتے وقت بعض ضروری حقائق ذہن میں رکھنے چاہئیں۔ ان میں سے اہم ترین حقیقت یہ ہے کہ منصوبہ بہت سخت

تاثرات

ہر وقت مسکراتی رہیے

شاید آپ کو یہ سن کر حیرت ہو کہ اگر آپ ہر وقت مسکراتے رہنے کی عادت ڈال لیں تو آپ کے لئے مسکرانے کی حالت میں غصہ ظاہر کرنا ناممکن ہو جائے گا۔ مسکرانے کے دوران میں چہرے کے پٹھے کچھ اس طرح قائم ہو جاتے ہیں کہ سخت بات نہیں کی جا سکتی۔ اس کے علاوہ ہر وقت مسکراتے رہنے سے آپ کا چہرہ زیادہ دلکش ہو جائے گا۔ اور آنکھوں میں چمک آ جائے گی۔

زبیدہ قدیر

بیوگی — سب سے بڑی مصیبت

بیوگی عورت کے لئے دنیا کی سب سے بڑی مصیبت ہے اور اگر بچے بھی ہوں تو بیوگی دوہری آفت بن جاتی ہے ایک تو شوہر کی موت کا غم، دوسرے اولاد کو پالنے کی فکر۔ اصل میں کسی عورت کا شوہر اس دنیا سے رخصت ہو جائے تو اس کی زندگی کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ اور اس کو دوبارہ شیرازہ بند کرنا، بڑی ہمت اور حوصلہ چاہتا ہے۔ بیوہ عورت کے رشتہ داروں اور پڑوسیوں کو اس کی ہر طرح حوصلہ افزائی کرنی چاہیئے۔

انیسہ عثمان

شادی کے صحیح معنے

شادی سوچ سمجھ، صبر و تحمل، بے غرضی اور قربانی کا مطالبہ کرتی ہے۔ بہت سی عورتیں اس کا احساس نہیں کرتیں۔ بلکہ بچے ہو جانے کے بعد بھی وہ اس احساس سے بے بہرہ ہی رہتی ہیں۔ آجکل زیادہ تر لڑکیاں اپنی پسند سے شادیاں کرتی ہیں۔ مگر چونکہ شادی کے صحیح معنوں سے ناآشنا ہوتی ہیں۔ اس لئے ان کی ازدواجی زندگی ناکام ہو جاتی ہے۔ ایسی عورتیں ہر خرابی کی ذمہ داری شوہروں پر ڈالتی ہیں۔ حالانکہ تھوڑی بہت ذمہ داری خود ان پر بھی ہوا کرتی ہے۔ ہر شادی شدہ عورت کو چاہیئے کہ وہ شادی کے صحیح معنے سمجھے۔ اور ان کو عملی جامہ پہنائے۔

شمیم آرا

زندگی کا دشوار مرحلہ

بڑھاپا زندگی کا ایک ایسا دشوار مرحلہ ہوتا ہے کہ اس میں کوئی ساتھ نہیں دیتا اور بوڑھی عورت خود کو بالکل تنہا محسوس کرتی ہے اس کی سہیلیاں یا تو مر کھپ چکی ہوتی ہیں یا ان میں سہلا یہ نبھلنے کی سکت نہیں رہتی۔ لڑکے لڑکیاں شادیاں ہو جانے کے بعد اپنے اپنے گھروں کے ہو جاتے ہیں۔ انہیں اپنے اپنے بال بچوں کی فکر پڑ جاتی ہے اس لئے بوڑھی ماں کی طرف توجہ نہیں دے سکتے۔ اس کے علاوہ اب بوڑھوں کی باتیں ان کی سمجھ میں بھی نہیں آتیں۔ اس لئے ہر عورت کو چاہیئے کہ اپنے کچھ مشغلے پیدا کرے تاکہ جب یہ دور آئے تو ان مشغلوں کی مدد سے خود کو مصروف رکھ سکے۔

فاطمہ بیگم

ہر حال میں خوش رہنے کا نسخہ

انسانی ذہن کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ گزری ہوئی باتیں یاد رکھ سکتا ہے۔ جب کبھی کسی انسان کی گزرتی ہوئی زندگی میں کوئی ایسی بات ہوتی ہے جو اسے ناگوار گزرتی ہے تو وہ اپنی گزشتہ زندگی کی خوشگوار باتیں یاد کر کے یہ ناگواری دور کر لیتا ہے۔ میرے خیال میں ذہن کی یہ صفت اس قابل ہے کہ انسان اس سے ہر حال میں خوش رہنے کا کام لے۔

ثروت آرا

خانہ دار عورت زندہ باد

خانہ دار عورت کا حال یہ ہے کہ اسے جو منصب ملا ہوا ہے اس میں کوئی شان نہیں ہے۔ نہ پرائیویٹ سیکرٹری، نہ ایئر ہوسٹس نہ ری سپشنسٹ صرف "خانہ دار" مگر کام کرنا پڑتا ہے۔ صبح سے رات کے نو دس بجے تک وہ بیک وقت باورچن، خادمہ، درزن، دھوبن سب کچھ ہے بچوں یا شوہر کے بیمار پڑنے میں نرس بھی بن جاتی ہے۔ اور بچوں کو پڑھانا پڑے تو استانی بھی اسی کو بننا پڑتا ہے مگر شوہر محبت کرتا ہو اور بچے اچھے اٹھیں تو وہ یہ سب کام بخوشی کرتی ہے۔ زندہ باد خانہ دار عورت! کیونکہ وہ زندگی کے نظام کی چول بنی ہوئی ہے۔

فوزیہ بانو

جی۔ایم۔ناز

الجھنیں

بچپن کے زخم

محترمہ صبوحی صاحبہ۔ بچپن کے زخم ذہن پر گہرا اثر کرتے ہیں۔ میرے خیال میں تو آپ بخوشی شادی کر سکتی ہیں۔ رہی بات اس کے تذکرے کی تو آپ ہزار معصوم سہی اس کے باوجود آپ کے بیان پر بھروسہ نہیں کیا جائے گا۔ اس لئے اس کا تذکرہ نہ ہی کرنا عقلمندی ہے۔ اس سے آپ کو نقصان ہی پہنچے گا۔ اب رہی بات آپ کی ڈائری کی تو محترمہ ڈائری لکھنا اچھی بات ہے۔ مگر ہمارے یہاں اس بات کا کوئی خیال نہیں رکھتا۔ کہ کسی کی پرائیویٹ ڈائری کو پڑھنا غیر اخلاقی بات ہے۔ اس لئے اس معاشرے میں ڈائری نہ لکھنا ہی بہتر ہے۔ اب جبکہ آپ کی ڈائری پڑھی جا چکی ہے اور اسے مسلسل پڑھنے کی جستجو بھی ہے تو بہتر ہو گا کہ آپ ان لوگوں کی تعریف لکھا کریں جن کی برائیاں لکھ چکی ہیں تاکہ اب پڑھنے کے بعد ان کا دل صاف ہو سکے

دانہ نہیں انار ہی کھٹا ہے

محترمہ افسر علی صاحبہ۔ آپ کا تو یہ خاندان پورا کا پورا ہی اونٹ کی طرح ہے۔ جس کی کوئی کل سیدھی نہیں ہوتی۔ ایک فرد الگ غیر اخلاقی حرکت کرتا ہے تو اس کا اثر تمام خاندان کے افراد قبول کرتے ہیں۔ انسان برائی بہت جلد اپنا لیا کرتا ہے۔ اچھائیاں اپنانے میں تکلیف ہوا کرتی ہے۔ آپ کے شوہر ان لوگوں میں سے ہیں۔ جنہیں ہوس پرست کہا جاتا ہے۔ ان لوگوں کا پیٹ بھر جاتا ہے مگر آنکھیں بھوکی ہی رہتی ہیں۔ حیا اور بے حیائی میں صرف بال بھر کا فرق ہوتا ہے۔ یہ بال ایک دفعہ نکل آئے تو پھر حیا اور اخلاق کا تصور بھی ختم ہو جاتا ہے۔

آپ کے پاس صرف دو ہی راستے ہیں ایک سختی کا دوسرا مصالحت کا اگر وہ آپ کی سختی کی بنا پر بد اخلاقی کو چھوڑ دیتے ہیں تو یہ سلسلہ جاری رکھنا پڑے گا۔ کیونکہ اگر آپ نے مصالحت کر کے ان کی بد اخلاقیوں کو قبول کرنا شروع کر دیا تو پھر وہ دیدہ دلیری سے آپ کی موجودگی کا بھی لحاظ نہیں رکھیں گے۔ ظاہر ہے لڑائی جھگڑا تو ہو گا ہی اگر لڑائی جھگڑے سے بچنا چاہتی ہیں تو پھر آپ کو ان کی بد اخلاقیوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے ہونگے اگر آپ میں یہ سب کچھ برداشت کرنے کی ہمت ہے تو پھر مصالحت کر لیجئے ویسے وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئیں گے چور چوری سے جاتا ہے۔ مگر ہیرا پھیری سے باز نہیں آتا۔ بہتر ہو گا کہ آپ اپنی امی سے کہہ دیں کہ وہ آپ کی بہن کو آپ کے گھر نہ بھیجا کریں تاکہ اس کی عزت محفوظ رہے ہمت اور صبر ہی آپ کا علاج ہے۔

جنون

محترمہ شہناز صاحبہ۔ آپ کی امی کا علاج ذہنی ہسپتال ہی میں ہونا چاہیئے۔ آپ کی خالہ کا یہ مقولہ غلط ہے کہ جو بچپن میں دکھی رہے۔ وہ ہمیشہ دکھی رہتا ہے۔ ایسا اندھیر تو نہیں ہوتا۔ زمانے کے ساتھ ساتھ حالات بھی بدلتے رہتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ کبھی حالات پر جمود طاری ہو جائے۔

وہی بات

محترمہ پروین اختر صاحبہ۔ آپ نے جس مرض کا تذکرہ کیا ہے دو سال قبل جو اس کا جواب دیا تھا وہی اب بھی ہے میں نے عرض کیا تھا کہ یہ مرض کم ہے اور عادت زیادہ۔ یعنی جسمانی غدود بعض لوگوں میں شدت سے متحرک ہو جاتے ہیں اور بعض میں کم۔ آپ جو کمزوری محسوس کرتی ہیں اس کی وجہ محض ہیجان کے بعد سکون کی کیفیت ہے۔ کمزوری محسوس ہونا لازمی ہے کیونکہ

آپ ہیجانی کیفیت سے گزرتی ہیں جس کی بنا پر غدودی اخراج بہت ہوتا ہے یہ کمزوری اس ہیجان کی بنا پر ہوتی ہے یہ کوئی ایسی بات نہیں کہ پریشان ہوا جائے تاہم آپ کو کسی لیڈی ڈاکٹر سے ضرور مشورہ کرنا چاہیئے۔ میرے خیال میں شادی کے بعد آپ درست ہو جائیں گی۔

جسم پر بال بھی انہیں غدود کے زیادہ محرک ہونے کی بدولت پیدا ہوتے ہیں ان کا علاج بھی مختلف ہارمون کے ذریعہ ہوا کرتا ہے۔ جو لیڈی ڈاکٹر کر سکتی ہے جنسی تبدیلی کی کوئی بات نہیں سر دست آپ کیلشیم کی گولیاں کھا سکتی ہیں۔ میں دوائی نہیں بتایا کرتا۔

آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا

محترمہ نسرین صاحبہ۔ مجھے نہیں معلوم کہ آپ کے والدین اس حد تک دلبرداشتہ کیوں ہو گئے ہیں۔ کہ ایک بار اگر رشتہ خراب ملا تو دوسری بار بھی اسی طرح کے لڑکے کے سر منڈھ رہے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ اپنے خاندان کا ہے یہ تو کوئی برائی نہ ہوئی۔ کہ خاندان میں اگر گدھا بھی ہے تو بہتر ہے بہر حال مسئلہ چونکہ آپ کے والدین کے ہاتھ میں ہے اس لئے میں آپ کو کیا مشورہ دوں۔ ظاہر ہے میں یہ تو کہنے سے رہا کہ آپ بغاوت کر دیں۔ یہی ہو سکتا ہے کہ امی کو سمجھائیں یا ابو تک بات پہنچا دیں شاید ان کی سمجھ میں آ جائے۔ ویسے ایک بات کہتا چلوں کہ اگر لڑکا صرف میٹرک ہے مگر اچھا کاروبار کرتا ہے تو تعلیم کی کمی کوئی برائی نہیں ہے میرا خیال ہے کہ آپ کے والدین رشتہ کرنے کے سلسلے میں بہت غیر محتاط ہیں اگر وہ لندن سے آئے ہوئے لڑکے کی تحقیق کر لیتے تو پھر طلاق کی نوبت نہ آتی۔ عام لوگوں کا خیال ہے کہ لندن میں ضرور کوئی بات ہے اور لندن کا نام سن کر ہی رشتہ کر دیتے ہیں حالانکہ لندن میں رہنے والوں کی اکثریت جاہلوں کی ہے۔ جو وہاں کوئلے کی کانوں میں کھدائی کرتے ہیں یا دوسری مزدوری وغیرہ۔ روپیہ ضرور جمع کر لیتے ہیں۔ ہوتے تو بہر حال قلی ہی ہیں۔ مزدور ہونا اچھی بات ہے لیکن مزدور اگر دھوکا دے تو وہ ایک اچھے پیشے کی بدنامی کا باعث بنتا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ ابھی تک تعلیم اور دستکاری میں ایک مصنوعی فرق پایا جاتا ہے۔ بہر حال وہ تمام حضرات جو لندن میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو لڑکیاں دیتے ہیں انہیں بہت ہی گہری تحقیق کر لینا چاہیئے۔ اور یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔

خط و کتابت کرتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

سگے بہن بھائیوں میں نفرت (بقیہ ص۱۶)

خوش ہوتے ہیں اتنے اوروں کی کامیابی سے نہیں ہوتے۔

البتہ اس میں ایک دشواری ضرور پیش آئے گی۔ والدین اور ان کے بچوں کی محبت دو طرفہ عمل ہوتا ہے۔ بعض بچے اپنے ماں باپ سے اتنا گہرا لگاؤ رکھتا ہے۔ کہ ماں باپ کو بھی اس سے خصوصی محبت کرنی پڑتی ہے ان کا یہ رویہ اور بچوں کو اس خاص بچے کا مخالف یا حاسد یا دشمن بنا سکتا ہے۔ تاہم اگر پختہ عمر کے مرد عورت احتیاط برتیں تو وہ اپنے حقیقی جذبات کو اور بچوں سے چھپا سکتے ہیں۔

بہر حال ایک ماں باپ کے بچوں کے آپس میں لڑنے جھگڑنے کی حقیقی وجہ یہی ہوا کرتی ہے کہ ان کے دلوں میں ایک دوسرے سے نفرت کا جذبہ موجود ہوتا ہے۔ چونکہ یہ جذبہ انسانی فطرت کے لئے قابل قبول نہیں ہے اس لئے ان کی باہمی انسیت ختم نہیں ہوتی اور جوں جوں بچے بڑے ہوتے جاتے ہیں ان کا یہ خیال پختہ ہوتا جاتا ہے کہ وہ ایک خون ہونے کی وجہ سے ایک ہیں۔

غلط توقعات کبھی قائم نہ کیجئے بقیہ ص۵

اس طرح کہ سمجھ بوجھ، خوش مزاجی اور خود سے الگ ہوکر خود کو تنقیدی نظر سے دیکھنے کی صلاحیت۔ ان تینوں صفات سے کام لے کر اپنے نقائص اور کمزوریوں کا جائزہ لیا جائے۔ اور ذہنی توازن ہر حالت میں برقرار رکھا جائے۔

اس طرح انسان اپنے آپ کو صحیح انداز سے دیکھنے لگے گا۔ اس لئے کبھی کوئی غلط توقع قائم نہ کرے گا۔ جو نوجوان مرد عورت ازدواجی زندگی میں قدم رکھ رہے ہیں ان کے لئے یہ نسخہ خصوصیت سے مفید ہے۔ انہیں چاہیئے کہ کسی معاملے میں کامیابی کی صد فی صد امید کبھی نہ رکھیں اور شروع ہی سے یہ سوچ لیں کہ ان کے اندازے کم سے کم بیس فی صد ضرور غلط نکلیں گے۔

یہ کون نہیں چاہتا کہ اس کے حالات زیادہ سے زیادہ درخشاں اور اس کی زندگی زیادہ سے زیادہ کامیاب اور بامراد ہو۔ مگر صرف کسی کے چاہنے سے کچھ نہیں ہو جایا کرتا۔ خارجی حالات اور دوسرے انسانوں کے رد عمل کے لئے بھی گنجائش رکھنی چاہیئے۔ ان کے اثرات راستے میں حائل ہو جایا کرتے ہیں۔ اس لئے ضروری نہیں کہ جو آپ کا دل چاہتا ہو ویسا ہی ہو بھی۔

غرض غلط توقعات قائم کرنا ایسی ذہنی خرابی ہے جس کا علاج ضروری ہے تاکہ آپ ان توقعات کے نتائج نکلنے کے بعد مایوسی کا شکار نہ ہوں۔

خوبصورت بننے کے نئے طریقے (بقیہ از صفحہ ۵۹)

جو خواتین اور لڑکیاں ہر وقت منہ بنائے رہتی ہیں ان کے چہرے کے عیب ہر ایک کو پہلی ہی نظر میں واضح طور پر دکھائی دے جاتے ہیں اسلئے ضروری ہے کہ اگر چہرے میں کوئی عیب ہو تو اس پر تبسم کا خوشنما پردہ ڈال دیا جائے اور اس پردے کو کسی وقت بھی نہ اٹھایا جائے بعض عورتوں کے پاؤں کالے جوتوں میں چھوٹے اور سفید جوتوں میں بڑے معلوم ہوتے ہیں چونکہ پاؤں کا چھوٹا ہونا خوبصورتی سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے ان عورتوں کو چاہیئے کہ سفید جوتے کبھی نہ پہنیں — اگر آپ کا پیٹ آگے کو نکلا رہتا ہے جس سے آپ کا جسم بدنما نظر آتا ہے تو آپ ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنا کریں۔ ایسے کپڑوں سے یہ عیب چھپ جاتا ہے — غرض اس قسم کی ترکیبوں سے ہر عورت اپنے عیبوں اور نقائص کو چھپا کر نظر نواز اور دلکش بن سکتی ہے۔

گھریلو کاموں کی منصوبہ بندی (بقیہ ص۶۲)

نہ ہو یعنی اس میں لچک رکھنی چاہیئے۔ لچک رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ کبھی کبھی وقت اور حالات کے لحاظ سے جو تبدیلیاں لازمی طور سے کرنی پڑیں گی۔ ان کے لئے گنجائش رکھنی چاہیئے اسی طرح ہنگامی حالات اور غیر متوقع یا اچانک واقعات سے نمٹنے کے لئے بھی منصوبے میں گنجائش ہونی چاہیئے۔ گھریلو کاموں کے کامیاب منصوبے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ یہ جس گھر کیلئے بنایا جاتا ہے اس کی حیثیت، ہیئت ترکیبی ذرائع آمدنی اور افراد خانہ کے مزاجوں کا اس میں ہر مرحلے پر لحاظ رکھا جاتا ہے منصوبے کی یہ بناوٹ اس بات کی ضامن بن جاتی ہے کہ اس پر عملدرآمد آسان ہوگا اور گھر کے سب افراد اس کو اپنی اپنی جگہ آرام و راحت کا ایک ذریعہ سمجھیں گے منصوبے کی حدیں یقینی آمدنی کی حدوں کے اندر اندر ہی رہنی چاہئیں۔

زیبا دسترخوان

سیخ کے گھریلو کباب

(صفیہ سلطانہ)

سامان۔ آدھ سیر گوشت۔ ادرک کی ایک ڈلی۔ سرخ مرچیں بقدرِ ذائقہ۔ لہسن کی ایک پوتھی۔ اتنی ہی دار چینی۔ ایک پاؤ کھٹا دہی۔ تھوڑا سا رائی کا تیل اور نمک بقدرِ ذائقہ۔

ترکیب۔ گوشت کے آدھا انچ موٹے ایک انچ لمبے اور ایک انچ چوڑے پارچے بنا کر انہیں صاف پانی سے دھو کر ایک طرف رکھ دو۔ پھر ادرک مرچوں اور دار چینی کو پیس کر اس مصالحے کو بھی ایک طرف رکھ لو۔ پھر گوشت کو خشک کر کے اس پر یہ مصالحہ، دہی اور رائی کا تیل ڈال کر انہیں آپس میں خوب ملو۔ اس مصالحہ لگے گوشت کو تقریباً تین گھنٹے تک اسی حالت میں رہنے دو۔ پھر اس کے آٹھ آٹھ، دس دس پارچے سیخوں پر اوپر تلے رکھ کر کوئلے کی آگ پر پکانے شروع کرو۔ اور ان پر بار بار گھی ڈالو۔ یہاں تک کہ گوشت نرم پڑ جائے۔ اس بات کا خاص طور سے خیال رکھنا چاہیئے کہ گوشت جلے نہیں ورنہ کبابوں کا ذائقہ تلخ ہو جائے گا۔ اگر کبابوں کے ساتھ پیاز کا لچھا، ہری مرچ، اور لیموں بھی ہوں تو دُگنا مزہ آئے گا۔ گرم گرم چپاتی یا پراٹھے کے ساتھ کھاؤ۔ گھر بیٹھے بازار کے کبابوں سے زیادہ ذائقہ آئیگا

قیمہ بھرے ٹنڈے

سامان۔ چھ بڑے بڑے ٹنڈے۔ بکرے کے گوشت کا قیمہ اتنی مقدار میں جتنی ان ٹنڈوں میں سما سکے۔ پیاز کی ایک گٹھی۔ ایک ٹماٹر۔ چائے کا آدھا چمچہ بھر پسا ہُوا گرم مصالحہ۔ ادرک کی ایک ڈلی۔ اور دو لال مرچیں۔

ترکیب۔ ٹنڈے ایسے منگوانے چاہئیں جو گول گول اور سخت ہوں (چپٹے اور پلپلے ٹنڈوں میں قیمہ بھرنا مشکل ہوتا ہے) پیاز، ٹماٹر، گرم مصالحہ، ادرک اور مرچیں پیس کر مصالحہ بنالو۔ پھر ٹنڈوں کو برابر برابر کے دو حصوں میں کاٹ کر ان کا گودا اور بیج نکال دو۔ اب فرائی پین میں تھوڑا سا گھی اور کچھ مصالحہ ڈال کر مصالحے کو بھونو۔ یہاں تک کہ وہ سرخ ہو جائے۔ تھوڑا سا پانی ضرور ڈالنا چاہیئے۔ تاکہ مصالحہ جلے نہیں جب یہ خوب اچھی طرح بھن جائے تو اس میں قیمہ بھی ملا دو۔ اور اسے گلا لو۔ یہ قیمہ ٹنڈوں میں بھر دو اور انہیں دھاگے سے باندھ دو۔ اب گھی اور باقی مصالحہ پتیلی میں ڈال کر مصالحے میں بھون لو۔ اور پھر ٹنڈے اس میں ڈال دو۔ چونکہ ٹنڈے خود بھی پانی چھوڑتے ہیں اس لئے پانی ڈالنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اگر مصالحہ لگنے لگے۔ تو پانی کے دو تین چھینٹے دے دو۔ پینتالیس منٹ کے اندر اندر قیمہ بھرے ٹنڈوں کا سالن پک کر تیار ہو جائے گا۔

(شمیم آرا)

پیاز کی بھاجی

سامان۔ آدھ سیر پیاز۔ دو تین خوب پکے ہوئے ٹماٹر۔ چائے کا ایک چمچہ بھر رائی۔ دو ہری مرچیں، چائے کا ڈیڑھ چمچہ بھر گھی یا تیل۔ تھوڑا سا پسا ہُوا گرم مصالحہ اور نمک بقدرِ ذائقہ۔

ترکیب۔ پیاز کو کتر لو اور ٹماٹر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کاٹ لو۔ پھر کڑھائی یا فرائی پین میں گھی کڑکڑاؤ اور رائی کو اس میں ڈال کر بھونو یہاں تک یہ چٹخنے لگے۔ اب اس میں کتری ہوئی ہری مرچیں بھی ملا دو۔ اور انہیں خوب بھونو۔ پھر پیاز اور ٹماٹر بھی ڈال دو۔ اور انہیں پکنے دو یہاں تک کہ نرم ہو جائیں۔ اگر چاہو تو پکنے کے دوران میں چائے کا آدھا چمچہ بھر املی کا گودا بھی ڈالا جا سکتا ہے۔ جب بھاجی پک کر تیار ہو جائے تو گرم مصالحہ چھڑک کر پراٹھے یا چپاتی سے کھاؤ۔ بڑا مزہ آتا ہے۔

(زبیدہ جاوید)

دوجیا عورت

(بقیہ صفحہ ۵۳)

مقامات پر کان لگا کر سنیں۔ اگر انہیں ایک ہی وقت میں دو دلوں کے دھڑکنے کی آوازیں سنائی دیں۔ تو یہ ثابت ہو جائے گا کہ پیٹ کے اندر دو بچے ہیں لیکن اگر ایکسرے ہی کروانا ہو تو ایامِ حمل کے آغاز میں نہ کروایا جائے۔ کیونکہ اس زمانے میں بچے کی ہڈیاں اتنی بڑی نہیں ہوتیں کہ چارٹ پر واضح ہو سکیں۔ غرض جب کوئی عورت امید سے ہو تو ہر اس معاملے میں جس کا تعلق اس کی ذات سے ہو بڑی احتیاط سے قدم اٹھانا چاہیئے۔

رومال کیلئے ایک کونہ اور پھول



سیدہ عالی گوہر قادری

تین دلکش پھول



فرخندہ اختر

حکیم سیّد ظفر عسکری

بزمِ زیب النساءؑ

خارش

سوال۔ میرے بچے کی عمر بیس سال ہے اسے کچھ عرصے سے خارش کی شکایت ہوگئی ہے۔ ہر وقت کھجاتا رہتا ہے کبھی کبھی جسم پر دانے بھی نکل آتے ہیں مگر دانوں سے پانی یا مواد نہیں رستا۔ کوئی عمدہ اور مفید نسخہ درکار ہے

(بیگم راحت علی قریشی۔ سیالکوٹ)

جواب۔ محترمہ۔ عرق منڈی ۵ تولہ۔ عرق شاہترہ ۱۰ تولہ۔ شربت عناب ۵ تولہ باہم ملاکر صبح و شام پئیں۔ غذا میں ہر اندازکی گرم تاثیر اشیاء مثلاً مچھلی انڈا۔ گوشت، بینگن۔ سرخ مرچ، اچار، مسور اور ارہر کی دال وغیرہ قطعی بند کردیں ٹنڈے، گھیا، لوکی، توری، شلغم، مولی، گاجر، سلاد، کلفہ کا ساگ وغیرہ جیسی سبز ترکاریاں زیرِ استعمال رکھیں۔

دلشاد رعنا صاحبہ کراچی

جواب۔ آپ بھی وہ نسخہ استعمال کرسکتی ہیں۔ جس کے بارے میں آپ نے دریافت فرمایا ہے انشاء اللہ مفید ثابت ہوگا

دانتوں کیلئے منجن

سوال۔ مجھے عرصہ تقریباً دو سال سے پائیوریا کی شکایت ہے۔ دانت سائے جلتے ہیں۔ مسوڑھوں سے الگ ہوتے جارہے ہیں۔ سارے دانت ہلتے ہیں میری عمر اٹھائیس سال ہے۔ بہت سے علاج کراچکی ہوں۔ مگر عارضی فائدہ ہوتا ہے اب آپ سے التجا ہے۔ کہ کوئی مفید منجن کا نسخہ تجویز فرمائیں جو اس شکایت کو دور کردے

فخر النساء۔ پشاور

جواب۔ محترمہ فخر النساء صاحبہ۔ پھٹکری سرخ پھول کی ہوئی ایک تولہ نمک لاہوری ۲ تولہ۔ سہاگہ پھول شدہ ایک تولہ۔ چھلکا اخروٹ سوختہ ۲ تولہ چھلکا بادام سوختہ ۲ تولہ۔ چھالیہ سوختہ ۲ تولہ۔ مازو سوختہ ایک تولہ۔ کالی مرچ ۶ ماشہ۔ عقرقرحا ۶ ماشہ۔ لونگ ۳ ماشہ

تمام اشیاء کو خوب باریک کوٹ چھان لیں۔ بس منجن تیار ہے عام انداز میں صبح و شام دانتوں اور مسوڑھوں پر ملیں

ملیریا بخار

سوال۔ میرے بچے کی عمر بارہ سال کی ہے اسے عام طور پر بخار کی شکایت رہتی ہے کچھ دن کے لئے ٹھیک ہوتا ہے پھر یہی مرض شروع ہو جاتا ہے بخار اکثر سردی کے ساتھ ہوتا ہے۔ حکیموں اور ڈاکٹروں کے کافی علاج کرا چکی ہوں مگر خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوا۔ سب یہی کہتے ہیں کہ یہ ملیریا بخار ہے اب آپ سے التجا ہے کہ برائے مہربانی کوئی مفید علاج تجویز کریں۔ دعاگو رہوں گی

بیگم احمد ربانی۔ اسلام آباد

جواب۔ محترمہ بیگم ربانی صاحبہ۔ لوبان کوڑیہ ۲ تولہ۔ پھٹکری پھول شدہ ۶ ماشہ نوشادر دیسی ۶ ماشہ۔ تینوں اشیاء کو خوب باریک کوٹ چھان کر سفوف تیار کریں اور محفوظ کرلیں۔ بقدر نصف ماشہ صبح اور اتنی ہی مقدار تو ایک شام کو پانی کے ہمراہ استعمال کرائیں۔ نہایت ہی مجرب نسخہ پیش کررہا ہوں۔ انشاء اللہ شفا ہوگی۔ غذا نہایت ہی ہلکی پھلکی کھانی ہوگی۔ عام طور پر مونگ کی دال کی کھچڑی چاول شوربہ۔ دلیہ اور ساگودانہ زیرِ استعمال رکھنا ہوگا پھلوں میں سیب انگور، میٹھا، لیمو، ناشپاتی، بگوگوشہ اور پپیتہ کھانے میں کوئی ہرج نہ ہوگا۔

(حکیم سید ظفر عسکری)